غمِ لازوال

مُرتّبین

مخدوم منوّر — وزیری پانی پتی

ادبی معیار پبلیکیشنز صدر کراچی ۳

تعلیقات

نام کتاب .... غمِ لازوال

مرتبین .... مخدوم منوّر۔ وزیری پانی پتی

ٹائیٹل .... خالد فاطمی

کتابت .... عالم علی خاں

طباعت .... رشید اینڈ سنز پرنٹرز پبلشرز

تعداد .... ایک ہزار

سالِ اشاعت سنہ ۱۹۷۹ء

ناشر

ادبی معیار پبلیکیشنز۔ صدر کراچی ۳

عرضِ مرتّب

ارسطو کے فلسفے کے مطابق "غم اندوزی" (CATHARSIS) کے بغیر شائستگیٔ نفس امرِ محال ہے یہ غم اندوزی مظاہر کرب ونشاط سے غیر ارادی طور پر مکتسب ہوتی ہے یعنی اس کے لئے کسبِ ارادی کی ضرورت نہیں ہوتی۔ یہ صلاحیت نفسِ انسانی میں موجود ہوتی ہے، تاہم اسے بھی "فکرِ ہر کس بقدرِ ہمتِ اوست" کے کلئے سے مستثنیٰ نہیں کیا جاسکتا۔

حضرتِ امام حسین علیہ السلام کا غم "اجتماعی غم اندوزی" (COLLECTIVECATHARSIS) کا مظہر ہے اس میں کسب ارادی کو صرف اتنا دخل ہے کہ انفرادی یا اجتماعی طور پر غمِ حسینؑ کا ذکر کیا جائے اس کے بعد کیتھارسس کا عمل خود بخود شروع ہو کر تہذیبِ نفس اور شائستگیٔ مزاج کی ضمانت بن جاتا ہے۔ فلسفے کی رعایت سے یہ سوال کیا جاسکتا ہے کہ آخر غمِ حسینؑ کا غیر مسلموں پر کیوں اثر نہیں ہوتا سطحی انداز میں تو اس کا جواب یہ ہو سکتا ہے کہ دوسری اقوام کے ٹریجڈیز یا المیوں کا بھی مسلمانوں پر اثر نہیں ہوتا لیکن اس سطح سے بلند ہو کر جب ہم امام حسینؑ کی ذات کو ایک عظیم مثالیئے کی حیثیت سے دیکھتے ہیں تو وہ آفاق گیر نظر آتے ہیں۔ شاید حسینیت کے اسی مرحلے کے متعلق جوش ملیح آبادی نے کہا ہے کہ

انسان کو بیدار تو ہو لینے دو ۔ ہر قوم پکارے گی ہمارے ہیں حسینؑ

دراصل غمِ حسینؑ کو ہم روایتی نقطۂ نظر سے دیکھنے اور سمجھنے کے عادی ہو چکے ہیں اور ہم نے اسے انسانی کیتھارسس بننے سے روک دیا ہے اور وہ حسینؑ جو تمام انسانوں کے لئے استعارۂ عظمت ہیں انھیں ہم نہایت تنگ نظری کے ساتھ اپنی میراث بنائے ہوئے پھرتے ہیں، آخر کیا حسینِ اعظمؑ کی اہمیت صرف اسی قدر تھی کہ چند مقررہ تاریخوں میں معینہ طور پر

ان کا ذکر کرکے امام بارگاہوں میں ماتم گساری کرلی جائے ؟ کیا اس شہیدِ انسانیت کے غم میں اسی حد تک اثر انگیزی کی طاقت ہے کہ صرف ماہِ عزا میں بطریقِ معروف چند ثانیوں کے لئے خروشِ گریہ کا مظاہرہ کیا جائے ؟ ہرگز نہیں، حسینؑ، لازوال ہیں۔ ان کا غم بھی لازوال ہے۔ یہ غم روایتی آدابِ شیون کا پابند اور محتاج نہیں ہے، خدانخواستہ میرا مدعا یہ ہرگز نہیں ہے کہ میں عزائے حسینؑ کی اہمیت کو گھٹانا چاہتا ہوں، بلکہ "فکرِ ہر کس بقدرِ ہمتِ اوست" کی صراحت کر رہا ہوں، دنیا میں کسی قوم کے لوگ اجتماعی طور پر شائستہ نفسی کے آئینہ دار نہیں ہوتے۔ اس لئے اگر اکثریتِ غالب اجتماعی غم اندوزی کے لئے روایتی اظہارِ غم کے وتیرے کو اپنائے ہوئے ہے تو یہ کوئی قابلِ اعتراض صورتِ حال نہیں ہے، میرا مدعا صرف یہ واضح کرنا ہے کہ غمِ حسینؑ کے متعلق ہر کہ ومہ کی تاثیر پذیری کا انداز مولانا ابوالکلام آزاد، خواجہ غلام السیدین، ڈاکٹر اعجاز حسین، ڈاکٹر ذاکر حسین اور پروفیسر سید احتشام حسین جیسا نہیں ہوسکتا، کیونکہ ہر شخص شائستہ نفسی کے اس معیار کا مظہر نہیں ہوسکتا۔ یہ شائستگی بڑے علم وخبر سے پیدا ہوتی ہے۔ اور علم کے بغیر آدمی خدا کو نہیں پہچان سکتا تو حسینؑ کو کیا پہچانے گا،

پیشِ نظر کتاب کی ترتیب واشاعت کی غرض وغایت صرف یہ ہے کہ روایتی ڈگر سے ہٹ کر حسینؑ اور حسینیت کا عرفان حاصل کیا جائے، لہٰذا اکابر اہلِ قلم کے ایسے مضامین ومنظومات کا انتخاب کیا گیا ہے، جن میں حسینؑ اور حسینیت کو انسانوں کے لئے مثالیے کی حیثیت دی گئی ہے اور بنیادی طور پر ہمارا مقصد اہلِ قلم کو غمِ حسینؑ کے اسی پہلو کی جانب متوجہ کرنا ہے۔ رہا کتاب کی ضخامت کا مسئلہ تو ممکن ہے ثقہ حضرات کو غیر اہم نظر آئے، لیکن ہمیں یقین ہے کہ ہمارا مقصد، مطمحِ نظر اور نصب العین ہرگز غیر اہم نہیں ہے ہم نے اپنی استطاعت کے مطابق کام کیا ہے۔ اب صاحبانِ استطاعت کو چاہیئے کہ وہ حسینؑ کے غمِ لازوال کو انسانی تہذیب اور شائستگیٔ نفس کا جزوِ اعظم بنانے کے لئے

میدان میں آئیں۔

مضامین کے علاوہ منظومات کے انتخاب میں بھی ہم نے روایت پرستی کا مظاہرہ نہیں کیا ہے اور اس میں غمِ حسینؑ کی آئینہ دار نثری نظمیں (PROSEPOEMS) بھی شامل کی ہیں،

فریاد کی کوئی لے نہیں ہے نالہ پابندِ نے نہیں ہے

آخر میں تمام معاونین کا عموی اور محترم پروفیسر کرار حسینؑ صاحب (سابق وائس چانسلر بلوچستان یونیورسٹی) کا خصوصی شکریہ ادا کرکے سپاس گذاری کا فرض ادا کرنا ضروری ہے، پروفیسر صاحب نے اپنی گوناگوں مصروفیات کے باوصف "غمِ لازوال" کی ترتیب واشاعت سے عملی دلچسپی کا ثبوت دیا ہے۔ علاوہ بریں میں "غمِ لازوال" کے سرورق کی تزئین کے لئے نوجوان مصوّر جناب خالد فاطمی اور ہمہ جہتی تعاون کے لئے جناب سیّد جواد حسین جعفری اور جناب نسیم درّانی مدیرِ سہ ماہی "سیپ" کا شکرگذار ہوں۔

اس کے علاوہ میں نوجوان شاعر و ادیب اور اپنے رفیقِ کار جناب مخدوم منور مدیر ماہنامہ "الفاظ" کا بھی ممنون ہوں کہ جنھوں نے "غمِ لازوال" کی ترتیب وتدوین کے ساتھ ساتھ اپنی انتھک کوششوں سے کتاب کی اشاعت کے لئے مالی وسائل بھی مہیّا کئے اور ان شعرائے کرام اور اُدبائے عظام کا بھی سپاس گذار ہوں جن کے مضامین و منظومات رسمی اجازت کے بغیر "غمِ لازوال" میں شریک کئے گئے۔

وزیری پانی پتی
سکریٹری
ادبی معیار پبلیکیشنز کراچی

ماتمیانِ شہِ مظلوم

دیباچہ	پروفیسر کرار حسین	۸
دیدۂ بینا کہیں جسے		۱۱
امامِ حریت	مولانا ابوالکلام آزاد	۱۱
ادب و ثقافت اور فنونِ لطیفہ پر حسینی اثرات	ڈاکٹر سید اعجاز حسین	۲۱
امام حسینؑ کی شخصیت و شہادت کا تجزیاتی مطالعہ	خواجہ غلام السیدین	۳۷
شہادتِ حسینؑ کا نفسیاتی پہلو	پروفیسر سید احتشام حسینؑ	۴۷
حسینؑ — ارتقائے انسانیت	ڈاکٹر ذاکر حسین	۵۲
تاریخ باغبانیِ صحرا		
اُردو مرثیہ پر ایک نظر	سید قدرت نقوی	۵۷
مرثیہ — ایک بیانیہ شاعری	الیاس عشقی	۷۲
سندھی شاعری میں ذکرِ حسینؑ	کریم بخش خالد	۸۵
ستو رنگ سے باندھوں		۹۳
جوش ملیح آبادی	فیض احمد فیض	
اُمید فاضلی	عارف عبدالمتین	
وزیری پانی پتی		

جگر خوں کردں ہوں میں — ۱۰۶

نجم آفندی

احمد ندیم قاسمی — فارغ بخاری

ثروت حسین — اقبال ساجد

سلیم کوثر

اصل میں مرگ یزید ہے

شہسوارِ کربلا	ابوالاثر حفیظ جالندھری	۱۱۲
حسینؑ سچائی ہے وفا ہے	مظفر وارثی	۱۱۴
جبر کی ریگ ہر اک سمت اڑی پھرتی تھی۔	عارف عبدالمتین	۱۱۵
سلام تجھ پہ مسلح بغاوتوں کے امام	فارغ بخاری	۱۱۷
اِمام عالی	کشور ناہید	۱۱۸
حسینؑ	حسن اکبر کمال	۱۲۰
داستانِ حرم	رئیس احمر	۱۲۱
سوچتی ہے کائنات	حسن سوز	۱۲۶
اندھیرے میں کوئی اُجالا	اقبال ارشد	۱۲۷

از حسینؑ آموختیم (نثری نظمیں)

لفظ اور مفہوم کا ملاپ	رئیس فروغ	۱۲۸
افق کربلا پر ڈوب جانے والے سورج کے نام	محمد علی سید	۱۳۲
غمِ لازوال	مخدوم منور	۱۳۴

دیباچہ

سیرت اور واقعہ

سیرت

ہر فرد ایک خاص تمدنی اور معاشرتی ماحول میں ظاہر ہوتا ہے۔ فرد اور ماحول کے مابین مختلف درجات میں اثراندازی کا عمل ہوتا ہے۔ اکثر افراد اپنے ماحول کی پیداوار ہوتے ہیں۔

کچھ افراد اپنے ماحول کو بدلنے میں کامیاب ہوتے ہیں۔

فرد کی وہبی اور اکتسابی صلاحیتیں اس عمل اور ردِّ عمل کے ذریعہ ایک نمونے (pattern) کی صورت میں نمایاں ہوتی ہیں۔ گویا فرد ایک مرکزی نقطہ ہے اور اس کی زندگی کا عمل اس مرکز کے گرد ایک دائرہ ہے۔ یہ مرکز اور دائرہ مل کر اس فرد کی سیرت بنتی ہے۔

سیرت کے لغوی معنی اصل میں "چلنے" کے ہیں۔ سیرت وہ حالت یا نہج ہے جس پر انسان زندگی کا راستہ چلتا ہے۔ یا زندگی کے ایک نمونہ یا اسوہ کی تخلیق کرتا ہے۔

ظواہر زندگی کی مدد سے فرد کی حقیقت کو سمجھنا اور فرد کی حقیقت کی روشنی میں زندگی کے عمل کی معنویت کو سمجھنا بالفاظ دیگر دائرہ سے مرکز کی طرف جانا اور مرکز سے دائرہ کی طرف لوٹ کر آنا سیرت کی معرفت ہے۔

عظیم اسوہ زندگی کے فن کا شاہکار ہے۔

جس طرح ہر فن کا ایک میڈیم ہوتا ہے لفظ یا آواز یا حرکت یا رنگ و خط یا سنگ و خشت اسی طرح اس فن کا میڈیم زندگی کے حوادث ہوتے ہیں جس طرح فنی

شاہکار ایک مقصد کے حصول کے لئے ذریعہ نہیں ہوتا بلکہ اس کے مقاصد اس کے اندر پیدا ہوتے ہیں۔ اسی طرح زندگی کا فن بھی کسی مقصد کو حاصل کرنے کا ذریعہ نہیں ہے بلکہ خود اپنے اندر مقاصد کی تخلیق کرتا ہے۔

جس طرح فنی شاہکار ایک خاص مکانی اور زمانی ماحول میں پیدا ہوتا ہے لیکن اس کی معنویت زمان اور مکان سے ماورا ہوتی ہے اسی طرح عظیم اسوہ ایک خاص زمانی اور مکانی حاشیہ میں ظاہر ہوتا ہے۔ لیکن اس کی معنویت زمان و مکان سے ماورا ہوتی ہے اور ہر شخص اور ہر زمانہ اپنے اپنے طور پر اس کی تعبیر کرتے رہتے ہیں۔

(۱) کسی ایک چھوٹے یا بڑے عمل کی مثلاً کھانا، پینا، سونا، عبادت کرنا، شادی کرنا، جنگ کرنا۔ غرض ہر عمل کی معنویت زندگی کے کلی سیاق میں یا انسانی مرتبہ کے لحاظ سے علامتی طور پر متعین ہوتی ہے۔

گر فرقِ مراتب نہ کنی زندیقی

(۲) اسوہ کی پیروی کے معنی کسی ایک فعل یا عمل کی نقالی کرنے کے نہیں ہیں۔ بلکہ اسوہ کی پیروی اس طرح ہوتی ہے جس طرح ایک فن کا مبتدی ایک عظیم فنی شاہکار سے اپنی صلاحیت اور سمجھ کے مطابق اپنی اور اپنے زمانہ کی ضرورت کے لحاظ سے فیض حاصل کرتا ہے۔

کلام پاک میں اسوہ کا لفظ تین جگہ آیا ہے دو جگہ حضرت ابراہیم کے سلسلے میں اور ایک جگہ حضورؐ کے سلسلے میں اور وہاں اس کے معنی سب سے کٹ کر اللہ کا ہو جانا، اللہ سے ذکرِ کثیر کے ذریعہ اپنا تعلق مضبوط کرنا اور باطل کے خلاف جہاد میں استقامت کے ہیں۔ اور یہ خصوصیات کوئی خاص عمل نہیں بلکہ عمل کی روحِ اخلاص ہے۔

واقعہ

ایسی ہی گذارشات ایک واقعہ کی اہمیت کو سمجھنے کے لئے مفید اور ضروری ہیں۔ ایک واقعہ کی اہمیت کا اندازہ لگانے کے لئے جو باتیں ہمیں اپنے سامنے رکھنی مناسب ہیں وہ یہ ہیں۔

(۱) جو صورتِ حالات اس واقعہ کی محرک تھی اس کے ردِ عمل میں کس مثبت اور قائم بالذات عمل کی تخلیق کی گئی۔ گویا جبر میں سے اختیار کی کیا صورت نکالی گئی۔

(۲) وہ واقعہ زندگی کے کیسے اعلیٰ مقاصد اور اقدار کا احاطہ کئے ہوئے ہے بالفاظ دیگر وہ واقعہ کس درجہ تاریخ کی رَو کو ظلمت و بہیمیت کی طرف بازگشت کرنے سے روکنے میں اور عدل و صداقت کی طرف موڑنے میں کامیاب ہوا۔

(۳) اس واقعہ نے انسانی زندگی کی ممکنات کو کس درجہ وسیع کیا۔ زندگی کے کتنے شیون تھے جو اس وقت تک ناممکن نظر آتے تھے جب تک وہ وقوع پذیر نہ ہوگئے۔

(۴) اس واقعہ میں انسانی زندگی پر اور تاریخی ادوار پر کیسا اور کتنا اثر انداز ہونے کی صلاحیت ہے۔

مختصراً ایک واقعہ کی اہمیت اس بات میں نہیں ہے کہ وہ کتنے گھن گرج اور دھوم دھڑکے کے ساتھ رونما ہوا، یا اس میں کتنا کشت و خون ہوا، یا کتنے آدمی اس میں شریک ہوئے یا کس حد تک اس نے دنیا کا سیاسی نقشہ بدلا بلکہ اس بات میں ہے کہ زندگی کے فنِ شریف میں حسن و صداقت کے کتنے نامعلوم پہلو اس نے اُجاگر کئے۔

ایک واقعہ کی اہمیت اس کی کمیت میں نہیں بلکہ اس کی کیفیت میں ہے۔

پروفیسر کرار حسین

امامِ حریّت

مولانا ابوالکلام آزاد

شمع ہا بُردہ ام از صدق بخاکِ شہداء
تادل و دیدۂ خوننا بہ فشانم دادند

آئیے، سب سے پہلے آج ایک بھولی ہوئی صحبتِ ماتم کو پھر تازہ کریں۔

کتنے دن گذر گئے کہ راہ ورسمِ ماتم وشیون سے ناآشنا ہیں نہ صدائے ماتم کی فغاں سنجی ہے اور نہ چشمِ خونبار کی اشک افشانی۔ کاروبارِ غم کی رونق افسردہ ہو چکی ہے اور رونقِ بازارِ درد کی چہل پہل مدت سے موقوف ہے۔

نہ داغِ تازہ می خارد، نہ زخمِ کہنہ می کارد
بدہ یارب دلے کیں صورت بیجاں نمی خواہم!

طرابلس کے خون آلود ریگستان کو اگر لوگوں نے بھلادیا۔ مشہدِ مقدس اور تبریز کا قصۂ الم اگر ذہنوں سے محو ہوگیا، مقدونیہ اور البانیہ کے تازہ ترین افسانہ ہائے خونیں اگر فکروں سے فراموش ہوگئے، توکچھ مضائقہ نہیں۔ اربابِ درد وغم کے لئے ایک ایسی داستانِ الم صدیوں سے موجود ہے، جوکبھی بھلائی نہیں جاسکتی۔ اور اگر لوگ اسے بھلا بھی دیں توبھی ہر سال چند ایسے ماتم آلود دن تازگیِ زخمِ کہن کے لئے آموجود ہوتے ہیں جواز سرِنو تیرہ سو برس بیشتر کے ایک حادثۂ عظیمہ کی یاد پھر سے تازہ کردیتے ہیں۔ اس سے میرا اشارہ حادثۂ ہائلۂ کبریٰ یعنی شہادت حضرت سیّدالشہداء علیہ وعلیٰ اجدادہ الصلوٰۃ والسلام

کی طرف ہے۔ عظم اللہ اجورنا بمصائبنا!

وقت است کہ در بیچ وخم نوحہ سرائی | سوز دنفس نوحہ گراز تلخ نوائی
وقت است کہ پردگیاں، کرزہ تعظیم | برو رگہ شاں کردہ فلک ناصیہ سائی
از خیمۂ آتش زدہ عریاں بدر آیند | چوں شعلہ رخاں بر سر شاں کردہ ردائی
جانہا ہمہ فرسودۂ تشویش اسیری | دل ہا ہمہ خوں گشتۂ اندوہِ رہائی

تنہاست حسین ابن علی در صفِ اعداء
اکبر! تو کجا رفتی، وعباس! کجائی؟

بیج یہ ہے کہ جن مردہ دلوں کو زندگی کے لئے سوز و تپش کی ضرورت ہو۔ جن ارباب درد کو روح کی راحت کے لئے جسم کے ماتم کی تلاش ہو۔ جن کی زبانیں آہ وفغاں کو محبوب، اور جن کی آنکھیں خوننابہ فشانی کو اپنا مطلوب ومقصود سمجھتی ہوں، ان کی صحبت ماتم والم کی رونق کے لئے یہی افسانہ اتنا کچھ سامانِ غم اپنے اندر رکھتا ہے۔ کہ اگر خون کے بڑے بڑے سیلاب سمندروں کی روانی سے بہہ جائیں اور بے شمار لاشوں کی تڑپ سے زمین کے بڑے بڑے قطعات یکسر جنبش میں آجائیں۔ جب بھی ان کی نداء حال اس الہام سرائی سے قاصر رہے گی، جو اس کے ایک ایک لفظ کے اندر سے توصیہ فرمائے عبرت وبصیرت ہے۔

لیکن آہ، کتنے دل ہیں جنھوں نے اس واقعہ کو اس کے حقیقی بصائر ومعارف کے اندر دیکھا ہے؛ اور کتنی آنکھیں ہیں، جو حسینؑ ابن علیؑ شہید پر گریہ وبکا کرتے ہوئے اس اسوۂ حسنہ کو بھی سامنے رکھتے ہیں، جو اس حادثۂ عظمیٰ کے اندر موجود ہے؟ فی الحقیقت یہ حق وصداقت، آزادی وحریت، امر بالمعروف ونہی عن المنکر کی ایک عظیم الشان انسانی قربانی تھی جو صرف اس لئے ہوئی تاکہ پیروانِ اسلام کے لئے ایک اسوۂ حسنہ پیش کرے اور اس طرح جہادِ حق وعدالت اور اس ثبات واستقامت کی ہمیشہ کے لئے ایک کامل ترین مثال قائم کر دے پس جو بے خبر ہیں ان کو رونا چاہیئے۔ ان لم تبکوا فتباکوا! اور جو روتے ہیں ان کو رونے ہی پر اکتفا نہ کرنا چاہیئے۔

ان کے سامنے سیدالشہدا نے اپنی قربانی کا اسوۂ حسنہ پیش کر دیا ہے اور کسی روح کے لئے ہرگز جائز نہیں کہ محبّتِ حسینؑ کی مدعی ہو، جب تک کہ اسوۂ حسینی کی متابعت کا اپنے اعمال کے اندر سے ثبوت نہ دے!

دنیا میں ہر چیز مر جاتی ہے کہ فانی ہے۔ مگر خونِ شہادت کے ان قطروں کے لئے جو اپنے اندر حیاتِ الٰہیہ کی روح رکھتے ہیں، کبھی بھی فنا نہیں۔

کشتگانِ خنجرِ تسلیم را
ہر زماں از غیب جانے دیگر است

سب سے پہلا نمونہ جو یہ حادثۂ عظیمہ ہمارے سامنے پیش کرتا ہے، دعوت الی الحق اور حق و حریت کی راہ میں اپنے تئیں قربان کرنا ہے۔

بنی امیہ کی حکومت ایک غیر شرعی حکومت تھی۔ کوئی حکومت جس کی بنیاد جبر و شخصیت پر ہو کبھی بھی اسلامی حکومت نہیں ہو سکتی۔ انھوں نے اسلام کی روحِ حریت و جمہوریت کو غارت کیا اور مشورہ و اجتماعِ امت کی جگہ محض غلبۂ جابرانہ اور مکر و خدع پر اپنی شخصی حکومت کی بنیاد رکھی۔ ان کا نظامِ حکومت شریعتِ الٰہیہ نہ تھا۔ بلکہ محض اغراضِ نفسیانیہ و مقاصدِ سیاسیہ۔ ایسی حالت میں ضرور تھا کہ ظلم و جبر کے مقابلہ کی ایک مثال قائم کی جاتی اور حق و حریت کی راہ میں جہاد کیا جاتا۔

حضرت سیدالشہدا نے اپنی قربانی کی مثال قائم کر کے مظالمِ بنی امیہ کے خلاف جہادِ حق کی بنیاد رکھی۔ اور جس حکومت کی بنیاد ظلم و جبر پر تھی، اس کی اطاعت و وفاداری سے انکار کر دیا۔

پس یہ نمونہ تعلیم کرتا ہے کہ ہر ظالمانہ و جابرانہ حکومت کا اعلانیہ مقابلہ کرو۔ اور کسی ایسی حکومت سے اطاعت و وفاداری کی بیعت نہ کرو جو خدا کی بخشی ہوئی انسانی حریت و حقوق کی غارت گر ہو اور جس کے احکام مستبدہ و جابرہ کی بنیاد صداقت و عدالت کی جگہ جبر و ظلم پر ہو۔

مقابلے کے لئے یہ ضروری نہیں کہ تمھارے پاس قوت و شوکتِ مادی کا وہ تمام

سازوسامان بھی موجود ہو جو ظالموں کے پاس ہے کیونکہ حسینؓ ابن علی کے ساتھ چند ضعفاء و مساکین کی جمعیتِ قلیلہ کے سوا اور کچھ نہ تھا۔ حق و صداقت کی راہ نتائج کے فکر سے بے پرواہ ہے۔ نتائج کا مرتب کرنا تمھارا کام نہیں۔ یہ اس قوت قاہرہ عادلۂ الٰہیہ کا کام ہے جو حق کو باوجود ضعف و فقدانِ انصار کے کامیاب و فتح مند کرتی، اور ظلم کو باوجود جمعیت و عظمتِ دنیوی کے نامراد و نگوں سار کرتی ہے۔

کم من فئۃٍ قلیلۃٍ غلبت فِئۃٍ کثیرۃ م باذن اللہ (۲۴۹:۲)

کتنی ہی چھوٹی جماعتیں ہیں جو بڑی جماعتوں پر حکم الٰہی سے غالب آگئیں!

ایسے موقعوں پر ہمیشہ مصلحت اندیشیوں کا خیال دامن گیر ہوتا ہے جو فی نفسہٖ اگرچہ عقل و دانائی کا ایک فرشتہ ہے، لیکن کبھی کبھی شیطانِ رجیم بھی اس کے بھیس میں آکر کام کرنے لگتا ہے۔ نفس خادع حیلہ تراشیاں کرتا ہے کہ صرف اپنے تئیں کٹوا دینے اور چند انسانوں کا خون بہا دینے سے کیا حاصل؟ توپ و تفنگ اور تخت و سلطنت کا مقابلہ کس نے کیا ہے کہ ہم کریں؟

آخری سوال کا جواب میں دے سکتا ہوں۔ تاریخ عالم کی صدہا امثال مقدسہ و محترمۂ جہاد سے قطع نظر، تمھارے سامنے خود مظلومِ کربلا کی مثال موجود ہے۔ تم کہتے ہو کہ چند انسانوں نے حکومتوں کی قوتوں اور سازوسامان کا مقابلہ کب کیا ہے کہ کبھی کبھی کیا جائے؟ میں کہتا ہوں کہ حسین ابن علیؑ نے صرف بہتر (۷۲) یا باسٹھ (۶۲) بھوکے انسانوں کے ساتھ اس عظیم الشان حکومتِ قاہر و جابر کا مقابلہ کیا۔ جس کے حدود سلطنت ملتان اور سرحد فرانس تک پھیلنے والے تھے۔

اور گو یہ سچ ہے کہ اسؑ[۱] نے اپنی آنکھوں کے سامنے اپنے دل کے ٹکڑوں کو بھوک اور پیاس کی شدت سے تڑپتے دیکھا اور پھر ایک ایک کرکے ان میں سے ہر وجود مقدس خاک و خون میں تڑپا اور جاں بحق تسلیم ہوا۔ اور یہ بھی سچ ہے کہ وہ دشمنوں سے نہ تو پینے کے لئے پانی چھین سکا اور نہ زندہ رہنے کے لئے اپنی غذا حاصل کرسکا۔ اور اس میں بھی شک نہیں کہ بالآخر سر سے لے کر پیر تک وہ زخموں سے چور رہوا ہو اور اس خلعت شہادت

---

[۱] مراد حضرت حسین علیہ السلام ہیں

لالہ گوں سے آراستہ ہوکر تیار ہوا۔ تاکہ اس کرشمہ ساز عجائب کے حریم وصال میں پہنچے۔ جو دوستوں کو خاک و خون میں تڑپاتا اور دشمنوں کو مہلت دیتا ہے۔

ارید وصالہ ویرید قتلی !

تاہم فتح اس کی تھی اور فیروزمندی و کامرانی کا تاج صرف اسی کے زخم خوردہ سر پر رکھا جا چکا تھا۔ وہ تڑپا اور خاک و خون میں لوٹا، پر اپنے اس خون کے ایک ایک قطرہ سے جو عالم اضطراب میں اس کے زخموں سے ریگ و سنگ پر بہتا تھا، انقلاب و تغیرات کے وہ سیلاب ہائے آتشیں پیدا کر دیئے۔ جن کو نہ تو مسلم بن عقبہ کی خون آشامی روک سکی، نہ حجاج کی بے امان خونخواری، اور نہ عبدالملک کی تدبیر و سیاست۔ وہ بڑھتے اور بھڑکتے ہی رہے۔ ظلم و جبر کا پانی تیل بن کر ان کے شعلوں کی پرورش کرتا رہا اور حکومت و تسلط کا غرور ہوا بن کر ان کی ایک چنگاری کو آتش کدہ سوزاں بناتا رہا۔ یہاں تک کہ آخری وقت آ گیا، اور جو کچھ ۶۶ھ میں کربلا کے اندر ہوا تھا وہ سب کچھ ۱۳۲ھ میں نہ صرف دمشق، بلکہ تمام عالم اسلامی کے اندر ہوا۔ صاحبان تاج و تخت خاک و خون میں تڑپے، ان کی لاشیں گھوڑوں کے سموں سے پامال کی گئیں۔ فتح مندوں نے قبریں تک اکھاڑ ڈالیں اور مُردوں کی ہڈیوں تک کو ذلت و حقارت سے محفوظ نہ چھوڑا اور اس طرح:-

وسیعلم الذین ظلموا ای منقلب ینقلبون (۲۶: ۲۷)	بہت جلد ظالم لوگ اس بات کو جان لیں گے کہ کس جگہ وہ سب لوٹائے جائیں گے۔

کا پورا پورا ظہور ہوا۔

پھر کیا یہ سب کچھ جو ہوا۔ وہ محض ابراہیم عباسی کی دعوت اور ابو مسلم خراسانی کی خفیہ ریشہ دوانیوں ہی کا نتیجہ تھا؟ کیا یہ اسی خون کا اعجاز نہ تھا۔ جو فرات کے کنارے بہایا گیا تھا؟ پھر یہ فتح مندی تو بہ حسب ظاہر ہے جس کے نتائج کے لئے ایک صدی کا انتظار کرنا پڑا۔ ورنہ فی الحقیقت مظلومیت کا خون جس وقت بہتا ہے، اسی وقت اپنی معنوی فتح مندی حاصل کر لیتا ہے۔

بہرحال یہ تو حق و صداقت کی قربانیوں کے نتائج ہیں جو کبھی ظاہر ہوئے بغیر نہیں رہتے۔ لیکن حضرت سید الشہداء کا اسوۂ حسنہ بتلاتا ہے کہ تم ان نتائج کی ذرا پرواہ نہ کرو۔ اگر ظلم اور جابرانہ حکومت کا وجود ہے تو اس کے لئے حق کی قربانی ناگزیر ہے اور اسے ہونا ہی چاہیئے۔ تعداد کی قلت وکثرت یا سامان و وسائل کا فقدان اس پر مؤثر نہیں ہو سکتا اور ظلم کا صاحب شوکت وعظمت ہونا اس کے لئے کوئی الٰہی سند نہیں ہے، کہ اس کی اطاعت ہی کرلی جائے۔ ظلم خواہ ضعیف ہو، خواہ قوی، ہر حال میں اس کا مقابلہ کرنا چاہیئے کیونکہ وہ ظلم ہے اور حق و صداقت ہر حال میں یکساں اور غیر متزلزل ہے۔

حق و عدالت کی رفاقت کی آزمائشیں زہرہ گداز اور شکیب ربا ہیں۔ قدم قدم پر حفظِ جان و ناموس اور محبتِ فرزند و عیال کے کانٹے دامن کھینچتے ہیں، لیکن یہ اسوۂ حسنہ مومنین و مخلصین کو درس دیتا ہے۔ کہ اس راہ میں قدم رکھنے سے پہلے اپنی طلب وہمت کو اچھی طرح آزمالیں۔ الیسا نہ ہو کہ چند قدموں کے بعد ہی ٹھوکر لگے۔ ؎ جرم راایں جاعقوبت ہست واستغفار نیست

اس قبیل جادۂ حق و صداقت کے چاروں طرف جو کچھ تھا، اس کا اعادہ ضروری نہیں کہ سب کو معلوم ہے، خدا تعالےٰ نے اپنی آزمائشوں کے متعدد درجے بیان کئے ہیں۔

وَلنبلونکم بشیٔ من الخوفِ والجوعِ ونقصٍ من الاموالِ والانفس والثمرات وبشر الصابرین الذین اذا اصابتھم مصیبۃٌ قالوا انا للہِ وانا الیہِ راجعون (۲، ۵۵، ۱۵۶)	اللہ تعالیٰ تمھیں آزمائشوں میں ڈالے گا وہ حالت خوف و ہراس بھوک اور پیاس نقصان مال و جان اور ہلاکت اولاد اقارب میں مبتلا کرکے، تمھارے صبر واستقامت کو آزمائے گا۔ پس اللہ کی طرف سے بشارت ہے ان کے لئے جن کے ثبات واستقامت کا یہ حال ہے کہ جب

مصائب میں مبتلا ہوتے ہیں تو اپنے تمام معاملات
کو یہ کہہ کر اللہ کے سپرد کر دیتے ہیں ۔ کہ
انّا لِلّٰہِ وَاِنَّا الیہِ راجعُون"

خوف و ہراس، بھوک اور پیاس، نقصان اموال و متاع، قتل نفس و اولاد، یہی چیزیں انسان کے لئے اس دنیا میں انتہائی مصیبتیں ہو سکتی ہیں۔ اس لئے ان ہی چیزوں کو راہ الٰہی کے لئے آزمائش قرار دیا گیا ہے۔

لیکن مظلوم کربلا کے سامنے یہ تمام مرحلے ایک ایک کر کے موجود تھے، وہ ان تمام مصائب سے ایک لمحہ کے اندر نجات پا کر آرام و راحت اور شوکت و عظمت حاصل کر سکتا تھا۔ اگر حکومتِ ظالمہ کی وفاداری و اطاعت کا عہد کر لیتا، اور حق و صداقت سے روگردانی کے لئے مصلحتِ وقت کی تاویل پر عمل کرتا پر اس نے خدا کی مرضی کو اپنے نفس کی مرضی پر ترجیح دی۔ اور حق کا عشق، زندگی اور زندگی کی محبتوں پر غالب آگیا۔ اس نے اپنا سر دے دیا کہ انسان کے پاس حق کے لئے یہی ایک آخری متاع ہے۔ پر اطاعت و اقرارِ وفاداری کا ہاتھ نہ دیا۔ جو صرف حق و عدالت ہی کے آگے بڑھ سکتا تھا۔

ومن الناس من یشتری نفسہُ ابتغآء مرضاتِ اللہ واللہ رؤف، بالعباد (۲ : ۲۰۷)	اور جو لوگ اللہ کی خوشنودی کی طلب میں جانیں تک فروخت کر دیتے ہیں اور اللہ بھی اپنے بندوں کے لئے شفقت و مہربانی رکھنے والا ہے۔

سب سے بڑا اسوۂ حسنہ کہ اس حادثۂ عظیمہ کی لسانِ حال اس کی ترجمانی کرتی ہے راہِ مصائب و جہادِ حق میں صبر و استقامت اور عزم و ثبات ہے کہ :-

ان الذین قالو ربّنا اللہُ ثُمّ استقامُوا (۴۱ : ۳۰)	بلاشبہ جن لوگوں نے کہا کہ ہمارا پروردگار اللہ ہی ہے اور پھر اس بات پر قائم رہے۔

دوسری جگہ کہا :-

فاستقم کما اُمرت (۱۱ : ۱۱۲)	پس چاہئیے کہ جس طرح تمہیں حکم دیا گیا ہے۔

(اے نبی) قائم رہیں (اپنی راہ میں استوار ہو جاؤ)۔

ولِلّٰہ درِّ ماقال

روئے کشادہ باید و پیشانیٔ فراخ
آں جا کہ لطمہ ہائے ید اللہ می زنند

فی الحقیقت اس شہادتِ عظیمہ کی سب سے بڑی مزیت وخصوصیت یہ ہے کہ اپنے عزیز واقارب، اہل وعیال اور فرزند احباب کے ساتھ دشتِ غربت ومصائب میں محصور ہونا، اپنی آنکھوں کے سامنے اپنے جگر گوشوں کو شدتِ عطش وجوع سے آہ و فغاں کرتے ہوئے دیکھنا، پھر اُن میں سے ایک ایک کی خون آلود لاش کو اپنے ہاتھوں سے اُٹھانا حتیٰ کہ اپنے طفلِ شیر خوار کا بھی تیرِ ظلم و بربریت سے نخچیر پانا۔ مگر باین ہمہ راہِ حق وصداقت میں جو پیمانِ صبر واستقامت باندھا تھا اس کا ایک لمحہ بلکہ ایک عشرِ دقیقہ کے لئے بھی متزلزل نہ ہونا اور حق کی راہ میں جس قدر مصائب واندوہ پیش آئیں سب کو شاکر و ممنت کے ساتھ برداشت کرنا کہ:۔ رضینا بقضاء اللہ وصبرنا علی بلائہٖ،

پیکاں ترا بجاں خریدار
من مرہم دیگراں نخواہم

دوست کے ہاتھ سے جامِ زہر بھی ملتا ہے تو تشنہ کامان زلالِ محبت اسے غیروں کے جامِ شہد وشکر پر ترجیح دیتے ہیں۔

اے جفا ہائے تو خوشتر از وفائے دگراں

آج بھی اگر گوش حقیقت نیوش باز ہو تو خاکِ کربلا کا ایک ایک ذرّہ توصیہ فرمائے صبر واستقامت ہے۔

شدیم خاک ولیکن ببوئے تربتِ ما
تواں شناخت کزیں خاک مردمی خیزد!

افسوس کہ تفصیل مطالب کا ارادہ نہیں اور وقت وگنجائش مقتضی اجمال وایجاز۔ اگر اس صبر واستقامت کے اسوۂ حسنہ کو دیکھنا چاہتے ہو تو خدارا اسفار تاریخ کی طرف توجہ کرو۔ صرف ایک روایت یہاں لکھوں گا تاکہ جو لوگ خاندانِ نبوت اور عترت حضرت

رسالتؐ کی محبت کا دعویٰ رکھتے ہیں، وہ غور کریں کہ ادعاۓ محبت بغیر متابعت بیکار ہے۔

ان المحب لمن یحب یطیع!

حضرت امام علی بن الحسین الشہیر بہ زین العابدین کہتے ہیں ۔

"انی لجالس فی العشیة التی قتل ابی الحسین فی صبیعتها وعمّتی زینب تمرضنی اذدخل ابی وھو یقول

یا دھر! اُف لك من خلیل — کم لك فی الاشراف والاصیل

من طالب وصاحب قتیل — والدھر لا یقنع بالبدیل

وانما الامر الی الجلیل — وکل حی سالك السبیل

ففھمت ماقال وعرفت واراد وخنقتنی عبرتی ورددت دمعی وعرفت انّ البلاد قد نزل بنا۔ واما عمّتی زینب فانّما لمّا سمعت ما سمعت والنساء من شأنهنّ الرقة والجزع فلم تملك ان وثبت تجرّ ثوبها حاسرة وھی تقول واثکلاه! لیت الموت اعدمنی الحیاة الیوم ماتت فاطمه وعلی والحسن بن علی اخی، فنظر الیها فردد غصته ثمّ قال: یا اختی! اتقی اللہ! فانّ الموت نازل لا محالة فلطمت وجهها وشقّت جیبها وخرّت معشیّا علیها وصاحت واویلاہ! واثکلاہ! فتقدّم الیها فصبّ علی وجھها الماء وقال لھا یا اختاہ! تعزی بعزاء اللہ فان لی ولکلّ مسلم اسوة برسول اللہ صلی اللہ علیه وسلم (تاریخ یعقوبی مطبوعہ لیڈن جلد دوم صفحہ ۲۹۰)

اس کا خلاصہ یہ ہے کہ حضرت امام علیؑ بن حسین زین العابدین علیہ السلام کہتے ہیں۔

جس رات کی صبح کو میدانِ شہادت گرم ہونے والا تھا، میں اسی شب کا واقعہ ہے کہ میں بیمار پڑا تھا۔ میری پھوپھی زینب میری تیمار داری میں مصروف تھیں۔ اتنے میں حضرت امام حسینؑ داخل ہوئے، وہ چند اشعار پڑھ رہے تھے جنہیں سن کر میں سمجھ گیا کہ ان کا ارادہ کیا ہے؟ میری آنکھوں سے بے اختیار آنسو جاری ہو گئے، اور مجھے یقین ہو گیا کہ ہم پر ابتلاء الٰہی نازل ہو گئی ہے اور اب اس سے چارہ نہیں۔

مگر حضرت زینب ضبط نہ کر سکیں، کیونکہ قدرتی طور پر عورتیں زیادہ رقیق القلب ہوتی ہیں۔ وہ ماتم کناں چلّا اٹھیں کہ واحسرتا! وامصیبتا الیوم ماتت فاطمہؓ وعلیؓ والحسنؓ بن علیؓ!

لیکن حضرت حسینؓ نے یہ حالت دیکھی تو ان کی جانب متوجہ ہوئے اور کہا اے بہن! یہ کیا بے صبری اور کیسا جزع و فزع ہے؟ اللہ سے ڈرو کہ موت یقیناً ایک آنے والی چیز ہے اور اس سے کوئی بچ نہیں سکتا۔

لیکن حضرت زینب شدتِ غم و خون سے مضطرب تھیں۔ وہ دیکھ رہی تھیں کہ آنے والی صبح کن واقعات خونیں کے ساتھ طلوع ہوگی۔ فرطِ غم میں انھوں نے اپنا چہرہ پیٹ لیا۔ گریبان پھاڑ ڈالا اور واویلا! واحسرتا! پکارتی ہوئی بیہوش اپنے بھائی پر گر پڑیں۔ حضرت حسینؓ نے یہ حالت دیکھ کر ان کے منہ پر پانی ڈالا، جب ہوش میں آئیں تو فرمایا:۔ اے بہن! یہ کیسا غم و حزن ہے جو تم کر رہی ہو؟ تمھیں چاہئے کہ اللہ کے حکم و فرمان کے مطابق جو طریق عزا و حزن و غم ہے، اسے اختیار کرو، کیونکہ میرے لئے اور ہر ایک مسلم کیلئے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی زندگی اور ان کے اعمال و افعال اتباع اور پیروی کے لئے بہترین نمونہ ہیں۔

اللہ اکبر! خاندانِ نبوت کے اس مرتبۂ رفیع اور اس درجۂ عظیم کو دیکھئے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا اسوۂ حسنہ کس طرح ان کے سامنے تھا۔ اور لَقَدْ کَانَ لَکُمْ فِی رَسُولِ اللّٰہِ اُسْوَۃٌ حَسَنَۃٌ کے حکم کے آگے کس طرح انھوں نے اپنے جذبات اور خواہشوں کو قربان کر دیا تھا؟ ایسے سخت اور زہرہ گداز موقع پر بھی اپنی بہن کا جزع و فزع گوارا نہ ہوا اور بجائے عام الفاظ صبر و تشفی کہنے کے، فرمایا تو یہ فرمایا۔ کہ فان لی ولکل مسلم اسوۃ فی رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم!!

پھر آج کتنے مدعیان محبتِ اہلِ بیت کرام ہیں جو اس اُسوۂ حسنہ کے اتباع کا اپنے اعمال سے ثبوت دے سکتے ہیں؟

(بشکریہ ابوسلمان شاہجہانپوری)

ادب و ثقافت اور فنونِ لطیفہ پر حسینی اثرات

ڈاکٹر سیّد اعجاز حسین

امام حسینؑ کو شہادت کے لئے مدینہ سے کربلا جانا پڑا اور شہادت کو ادبی وفنّی مرتبہ حاصل کرنے کے لئے عرب و ایران ہوتے ہوئے ہندوستان آنا پڑا عجب کیا کہ یہ ادبی سفر اس خواہش کا پرتو ہو جو امام حسینؑ نے یزید سے کی تھی کہ اگر تجھے میری ذات وقیام سے اندیشہ ہو تو مجھے ہندوستان چلا جانے دے۔ حالات نے امام کو ہندوستان نہ آنے دیا مگر شہیدِ اعظم کی یہ خواہش قدرت بھی رد نہ کر سکی۔ جسمانی طریقہ پر نہ سہی ایک دوسری شکل میں ایک نئے انداز میں یہ جذبہ پایۂ تکمیل کو پہنچ گیا۔ سرزمینِ ہند اس برگزیدہ ہستی کے نزولِ اجلال سے محروم رہی۔ مگر اس کا تذکرہ جس شدّ و مد کے ساتھ یہاں ادبی لحاظ سے ہوا وہ کچھ کم اہم نہ تھا۔ یہ فخر نہ عرب کو نصیب ہوا نہ عجم کو عربی و فارسی سب منہ دیکھتی رہیں اُردو نے معرکہ سر کر لیا اور فاتحانہ انداز سے سر اٹھا کر ان زبانوں سے کہا کہ میرے تاج میں ایک ایسا کوہ نور ہے جو میری امتیازی حقیقت کا سبب بن جاتا ہے۔ میں نے واقعات کربلا کو جس آب و تاب، لطافت و ادبیت کے ساتھ پیش کر دیا ہے۔ وہ میری حیات کو ابدیت سے ہمکنار کرنے کے لئے کافی ہے۔ بعض ادبی مورخوں کا کہنا ہے کہ اردو زبان میں جو اشعار سب سے پہلے کہے گئے وہ واقعات کربلا شہادتِ حسینؑ سے متعلق تھے یعنی مرثیہ اصناف میں سنگ بنیاد کی حیثیت رکھتا ہے اسی کو بنیاد بنا کر اردو نظم نے ادبی تعمیر شروع کی۔ ممکن ہے اس رائے سے لوگ متفق نہ ہوں، مگر اس سے انکار تو کوئی لکھا پڑھا آدمی نہیں کر سکتا کہ جب سے ہماری شاعری کی ابتدا ہوئی

اسی زمانہ سے مرثیے کا بھی سراغ اردو میں ملتا ہے۔ جنوبی ہند کا ادبی کارنامہ اس بات کی پوری شہادت دیتا ہے۔ وہاں زبان کی نشوونما کے ابتدائی مراحل مرثیے تیزی سے طے کر رہے تھے۔ ممتاز شعرا، خواہ بادشاہ ہو یا سالکِ راہِ محبت غرض کہ خواص و عوام سب نے مرثیہ کہنا اور سننا باعثِ سعادت سمجھا۔ کیسا کہا۔ اچھا یا برا اس بحث کو چھوڑیئے ہم کو تو صرف یہ عرض کرنا ہے کہ مرثیے کثرت سے کہے گئے یہاں تک کہ ایک رجحان پیدا ہو گیا۔ ابتدائی کاوشوں میں جو فنی کمی ہو سکتی ہے وہ ضرور ان مرثیوں میں ہے مگر خلوص اور درد کی کوئی کمی نہیں، ان مرثیوں کی اہمیت اس لحاظ سے بہت ہے کہ واقعۂ کربلا ایک خاص جزوِ ادب بن گیا۔ یہ مرثیے عموماً محرم میں پڑھے جاتے، لوگ ان کا سننا داخلِ ثواب سمجھتے یہاں تک کہ مرثیہ خوانی کا رواج ہوا کہ مرثیہ محرم منانے کے لئے ناگزیر معلوم ہونے لگا۔ شمالی ہند میں اردو کے ممتاز و سربرآوردہ فنکاروں نے بھی مرثیہ کہنا باعثِ ثواب و عزت خیال کیا۔ میر و سودا نے بھی اس صنف سے دلچسپی لینا ادبی فریضہ خیال کیا بلکہ سودا نے تو ناقدانہ نظر ڈال کے اس کو اس قابل سمجھا کہ جو توجہ اب تک اس ضمن میں کی گئی ہے۔ اس سے کہیں زیادہ وقعت کا مرثیہ مستحق ہے۔ اس سلسلے میں شمالی ہند کو ادبی تاریخ کے اعتبار سے ایک گوہرِ نایاب عطا ہوا۔ واقعۂ کربلا اور ایمان کو تازہ رکھنے کے لئے فضلی نے ایک کتاب مرتب کی جس کا نام "دہ مجلس" تھا۔ نام ہی سے معلوم ہوتا ہے کہ محرم کے دس دن تک کو ذکرِ حسینؑ سے گرم کرنے کے لئے یہ کتاب لکھی گئی تھی جو اردو نثر کی پہلی تصنیف سمجھی جاتی ہے۔ گویا یہاں بھی اردو زبان کو اپنے وجود کا تحریری نشان واقعۂ کربلا کی بدولت ملتا ہے۔

مرثیہ اب تک سیدھے سادے طریقہ پر کہا جاتا تھا اس کا منشا زیادہ تر واقعاتِ کربلا بیان کرنا، گریہ و بکا سے ایمان تازہ کرنا تھا۔ سودا نے اس روش میں تبدیلی و ترقی چاہی انھوں نے چاہا کہ مرثیہ کو محض گریہ و بکا تک محدود رکھنا مناسب نہیں اس میں ادبیت و شعریت کا لانا ضروری ہے۔ ان کی یہ رائے ایک عالم با عمل کی تھی انھوں نے خود بھی فن و ادب کا لحاظ رکھ کر مرثیے کہے اور دوسروں نے بھی اب ترقی یافتہ صورت

22807

میں اس کو پیش کرنا شروع کیا۔ سوداؔ قصیدہ و ہجو کے لئے مشہور تھے وہ ہنسنے ہنسانے والے انسان سمجھے جاتے تھے۔ ان کو گریہ و بکا کی اتنی اہمیت کیوں محسوس ہوئی کہ اسکو وقیع بنانے کے لئے اس طرح کمربستہ ہوگئے کہ خود بھی مرثیے کہے اور دوسروں کو بھی اس صنف سے زیادہ دلچسپی لینے پر آمادہ کیا۔ یہ تبدیلی صرف واقعۂ کربلا کے اثر سے ہوئی جس نے رفتہ رفتہ زندگی کے ہر گوشے کو منوّر کر دیا۔ چنانچہ اس نے ادب کو بھی نگاہِ کرم سے سرفراز فرمایا۔ اہلِ سخن کو ثواب سے اور ادب کو شعریت سے مالا مال کرنے کا بھی راستہ سمجھا دیا۔

دہلی میں مختلف وجوہات کے سبب مرثیہ کو وہ بلندی نصیب نہ ہوسکی جو آگے چل کر لکھنؤ میں ہونے والی تھی۔ اس کے مختلف اسباب کا یہاں بیان کرنا شاید خارج از بحث ہو اس لئے صرف یہ عرض کر کے ہم آگے بڑھ جانا چاہتے ہیں کہ یہاں مذاقِ مرثیہ گوئی وہ سرپرستی و پختگی نہ حاصل کرسکا جو تاجدارانِ اودھ کے دورِ حکومت میں اسے میسّر ہوئی۔ بڑے بڑے فن کار یہاں بھی تھے۔ میرؔ و سوداؔ کے بلند پایہ فن کار ہونے میں کس کو کلام ہوسکتا ہے مگر مرثیہ جس انہماک و یکسوئی کا مطالبہ، بلندی تک پہنچنے کے لئے کر رہا تھا وہ یہ شعراء پورا نہ کرسکتے تھے۔ یہ لوگ غزل، قصیدہ، مثنوی وغیرہ سب سے اتنی ہی دلچسپی لے رہے تھے کہ ان اصناف کو ترک کر کے صرف مرثیہ کا ہو رہنا ان کے لئے ممکن نہ تھا اور مرثیہ کا تقاضا تھا کہ "یک در گیر و محکم بگیر" یہ شرکتِ غیر کو گوارا نہ کرتا تھا؛ دوسرے اصناف کو منہ لگانے والوں کو وہ منہ نہیں لگانا چاہتا تھا۔ اسکا یہ تقاضا خاطر خواہ لکھنؤ میں پورا ہوا۔ ضمیرؔ، انیسؔ، دبیرؔ نے اپنی ساری ادبی زندگی اسی کے لئے تج دی جب کہیں یہ صنف معراجِ کمال تک پہنچ سکی۔

لکھنؤ کی ادب نوازی۔ علم پرستی، شیعیت سے دلچسپی، مرثیہ کے عروج کے لئے بڑی سازگار ثابت ہوئی، یہاں کے حکمران سب شیعہ تھے، محرّم اور واقعۂ کربلا سے ان کو خاص شغف تھا۔ باوجود رنگ رلیوں کے وہ مذہب کے دلدادہ تھے گو یہ فضا جنوبی ہند میں کبھی ایک زمانہ تک رہی مگر وہاں مرثیہ ابھی گھٹنیوں چل رہا تھا۔ ادبی نشو و نما کے

لحاظ سے وہ اپنے پیر پر کھڑے ہونے کی عمر تہ پاسکا تھا نہ انیس و دبیر ایسے فنکار اس کو مل سکے تھے بہرحال واقعۂ کربلا کو اپنی گوناگوں خصوصیات کی وجہ سے لکھنؤ میں وہ ادبی وفنی معراج مرثیہ کی صورت میں نصیب ہوئی جواب سے پہلے کبھی نہ ہوئی تھی۔ یہی نہیں ہوا کہ مرثیہ نے اردو میں ایک صنف کا اضافہ کیا بلکہ اس نے اردو ادب کو امتیازی حیثیت بھی عطا کی۔

اس اجمال کی تفصیل کے لئے تو ایک کتاب کی ضرورت ہے مگر مختصر یہ کہا جا سکتا ہے کہ اس نے ہمارے ادب کے تخیل، مزاج وکردار اور شعور کو وہ راستہ دکھایا کہ گویا ایک نئی دنیا سامنے آگئی جس میں حقیقت واخلاق کو فن کے پردۂ سیمیں پر ایک خاص اہتمام کے ساتھ پیش کیا جارہا تھا جس کو دیکھ کر دنیا کی آنکھیں کھل گئیں۔ اب سے پہلے بھی مرثیہ تھا اور اردو کے وجود سے قبل عربی وفارسی میں اچھا خاصا ذخیرہ تھا، جنوبی ہند نے اُردو کو اس سے روشناس کرادیا تھا اور بعد میں شمالی ہند کے شعرا نے عقیدتمندی سے اس پر طبع آزمائی بھی کی تھی۔ لیکن ادبی شہ کار کی صورت میں نمایاں ہونے کا موقع ضمیر اور دبیر کے زمانہ میں آیا۔ ان بلند پایہ فنکاروں نے رُوداد کربلا کو صرف مذہب کے پرستاروں تک محدود نہ رہنے دیا بلکہ ادب کی جان بنادی۔ اردو ادب کی نشوونما اور ارتقا کو نقاد دیکھ شرماجاتا تھا یا کم ازکم فخریہ انداز میں سر اونچا نہ کرتا تھا، کیونکہ اس ذخیرہ میں زیادہ تر حسن وعشق کے واقعات تھے یا امرا۔ بزرگانِ دین کی تعریفیں تھیں باقی اور باتیں نہ ہونے کے برابر تھیں۔ کردار نگاری منظرکشی مثالی اور رسمی ہوکر رہ گئی تھیں۔ رزمیہ شاعری کا نام ونشان بھی نہ تھا۔ گھریلو زندگی کا نقشہ نظروں سے اوجھل تھا۔ مرثیہ نے بیک وقت ساری کمی پوری کردی۔

آیئے اب اس دعوے کی دلیل پر بھی ایک تنقیدی نظر ڈال لی جائے اردو شاعری کا سب سے مہتم بالشان ذخیرہ غزلوں کا انبار تھا اس بحث سے الگ ہوکر کہ غزل نیم وحشی صنف سخن ہے یا غزل اردو ادب کی آبرو ہے ہم کو اس کی اہمیت اور کارگزاری تسلیم ہے مگر یہ خیال رہے کہ اس میں زیادہ تر حسن وعشق کی داستان ہے کسی ادب کا ان ہی

حدود میں رہ جانا نہ قابلِ ستائش ہے نہ لائقِ فخر۔ ادب کو زندگی کے ہر شعبہ میں حاوی ہونا چاہیئے۔ مختلف و متعدد جذبات پیش کرنا چاہیئے۔
بغیر اس کے محسوس ہوتا ہے کہ ساری قوم عشق و عاشقی کی ماری ہوئی ہے۔ صرف اپنی فکر ہے دوسروں کے بارے میں نہ سوچتی ہے نہ سمجھتی ہے گویا یہ ادب ایک محدود و مخصوص طبقہ کی ترجمانی کرتا ہے۔ مرثیے کے عروج سے پہلے کم و بیش ہماری غزلوں کا یہی حال تھا۔ شدت سے بعض باتوں کی کمی محسوس ہوتی تھی۔ جی چاہتا تھا کہ کچھ ایسے کردار بھی ملتے جو اخلاق کے اعلیٰ نمونے ہوتے حسن و عشق کے علاوہ کچھ اور باتیں بھی کرتے محبوب کی محفل سے نکل کر میدان جنگ میں بھی نظر آتے۔ بچّے بھی ان میں چلتے پھرتے نظر آتے جوان بھی دشمنوں سے نبرد آزما ہوتے۔ محبوب کے سوا باپ، بہن، بھائی، ماں، آقا، غلام اور دوسرے عزیزوں سے بھی ہم کلام ہوتے۔ نگاہیں ایسے کرداروں کو اردو شاعری میں ڈھونڈتی تھیں اور مایوس ہوکر واپس آتی تھیں۔ مرثیہ نے واقعاتِ کربلا کو پیش کر کے خوبی سے یہ کمی پوری کردی۔
اِس سلسلے میں جو واقعات و کردار آئے وہ تاریخی و حقیقی تھے کسی ادبی خالق کے مرہونِ منت نہ تھے اور خوش قسمتی سے یہ لوگ ہر لحاظ سے بڑے اوصاف اور بڑی بلندی کے مالک تھے خوشی اس کی ہے کہ ان کو اردو میں پیش کرنے والے بھی علاوہ زبردست فنکار ہونے کے خلوص اور انہماک کے مجسمہ تھے ان کو مرثیے سے وہ شغف تھا کہ کسی اور صنفِ سخن کی طرف نگاہِ غلط انداز سے بھی دیکھنا گوارا نہ کرتے وہ صرف مرثیہ کے لئے تھے اور مرثیہ ان کے لئے مرثیہ جس قدر وفا و استقلال کا مطالبہ کرتا تھا اس کو انیس و دبیر نے بدرجۂ اتم پورا کرنے کی کوشش کی وہ باوضو ہوکر مرثیہ کہتے تھے وہ اپنا تن من دھن سب کچھ اس پر نثار کرتے رہے ان کے نزدیک مرثیہ گوئی ایک مذہبی فریضہ تھی جس کو وہ بصد احترام و خلوص زندگی بھر پورا کرتے رہے،
پہلی بار اردو ادب کو محسوس ہوا کہ صداقت کی بنیاد پر ادبی تعمیر اتنی عظیم الشان و بلند پایہ ہوسکتی ہے کہ جس میں ایک دنیا اخلاقی قدروں کی فضا میں سانس لیتی، چلتی پھرتی دکھائی

جا سکتی ہے۔ شجاعت کے بلند ترین کارنامے، صبر و تحمل کے بے نظیر نمونے۔ گھریلو زندگی کے دلکش نقشے، علم و عمل کے لاجواب مظاہرے۔ بیک وقت اردو شاعری میں نظر آئے جیسے ساری ادبی فضا بدل گئی۔ رقیب و محتسب کی جگہ شجاعانِ عرب میدانِ جنگ میں تلواروں سے کھیلتے دکھائی دیئے۔ محبوب کی فرضی تخیلی۔ صورتوں کی بجائے وہ مخدراتِ عصمت نظر آئیں جن کے دامن پر نماز پڑھنا فرشتے بھی باعثِ فخر سمجھیں، روائتی رسمی وفا و جفا کو چھوڑ کر وہ حق و باطل کی معرکہ آرائی پیشِ نظر ہوئی جس کی مثال دنیا ابتک اس شان سے نہ پیش کر سکی تھی۔ امام حسینؓ کا تو ذکر ہی کیا ان کے لئے تو اقبال نے بھی دنیا کو بتا دیا کہ:

اللہ اللہ بائے بسم اللہ پدر　　　معنئ ذبحِ عظیم آمد پسر

ان کے کارنامے حیاتِ نو کا پیام تھے وہ بیک وقت جملہ خوبیوں سے متصف تھے ان کے اعزا و اقربا و رفقا۔ اور احباب کے کردار، جو اوصافِ حمیدہ کے مالک تھے۔ اس شان سے اردو مرثیوں میں آئے کہ ادب کی ذہنی سطح کو دفعتاً بلند کر گئے خوبی یہ تھی کہ اس سے پہلے مرثیہ محض مذہب کی جاگیر سمجھا جاتا تھا۔ مگر اب ادب کا بہترین کارنامہ معلوم ہوا۔ مثنوی و قصیدہ کہنے والوں کو محسوس ہوا کہ محاکاتی شاعری اس کا نام ہے۔ گھوڑے کی تعریف یوں کی جاتی ہے۔ مناظرِ قدرت کا نقشہ اس طرح کھینچا جاتا ہے۔ میدانِ جنگ میں تلوار یوں چلتی ہے۔ غزل والوں کو اندازہ ہوا کہ عملاً راہِ محبت میں کس طرح جان دی جاتی ہے۔ وفا کی دشوار گذار گھاٹیوں سے مردانِ خدا کس طرح خرم و خندان گذر جاتے ہیں۔ مرنے والے کس جوانمردی سے جان دیتے ہیں۔ اور اردو شاعری کو یہ محسوس ہوا کہ تسلسل کے ساتھ حقیقت کو مدِ نظر رکھتے ہوئے فن کار کس طرح کامیاب ہوتا ہے۔

اس سے پہلے اردو شاعری نے میدانِ جنگ میں چلتی ہوئی تلوار کبھی نہ دیکھی تھی۔ نیزوں کا چمکنا، گھوڑوں کا دوڑنا۔ مجاہدوں کا پہلوانوں سے لڑنا۔ سپاہیوں کا آگے بڑھنا، پیچھے ہٹنا۔ بھوک پیاس کی شدت میں جنگ کرنا۔ یہ سب مناظر اردو نے مرثیہ کی بدولت دیکھے، بزم کا سامان تو ہماری شاعری نے بہت کچھ مہیا کر دیا تھا مگر رزم و آلاتِ حرب

سے اس کا دامن خالی تھا۔ اس میں مر جانے کی صلاحیت تو ضرور پیدا ہوگئی تھی مگر گھٹ گھٹ کر سپاہی کی طرح میدانِ جنگ میں اس نے جان دینا نہ سیکھا تھا یعشوق پر قربان ہو جانا اسے آتا تھا۔ مگر بھائی پر جان دینا، ماموں کے لئے لڑ مرنا۔ باپ پر نثار ہو جانا آقا کے صدقے ہو جانا۔ یہ سب اس نے خواب میں بھی نہ دیکھا تھا۔ بلا خوفِ تردید یہ کہا جاسکتا ہے کہ رزمیہ عناصر اردو میں صرف مرثیوں کی وجہ سے آئے اور ان مرثیوں کی بنیاد واقعۂ کربلا پر تھی۔

طوالت کے اندیشے سے بالتفصیل اس پر گفتگو نہیں کی جا سکتی کہ اُردو کے مختلف اہم اصنافِ سخن پر مرثیہ کہاں تک اثر انداز ہوا مگر اختصار کے ساتھ ان اثرات کی مثالیں پیش کی جا سکتی ہیں جن سے اندازہ ہو سکے کہ ہمارے شعراء نے واقعاتِ کربلا سے متاثر ہو کر جابجا اشعار میں ایسے اشارے پیش کئے جو ان کے ذہنی اثرات کا پتہ دیتے ہیں۔

سینہ کوبی سے زمیں ساری ہلا کے اُٹھے　　کیا علم دھوم سے تیرے شہدا کے اُٹھے
(مومن)

کریں تم سے ہم بے رُخی توبہ توبہ　　یہ کوفی کریں گے یہ شامی کریں گے
(داغ)

جہاں میں عرصۂ عشرت کے سوا وہ چند ہے غم کا　　اگر ہو عید کا اک دن تو عشرہ ہے محرم کا
(ذوق)

ہنستے ہو سُن کے مرا حال کہاں تا۔ دیکھوں　　بے رُلائے یہ کہیں مرثیہ خواں اُٹھتا ہے
(ناسخ)

بے جرم بے گناہ نہ عاشق کو قتل کر　　کعبہ تری گلی ہے کہیں کربلا نہ ہو
(وزیر)

دل چاک چاک ابروئے خمدار نے کیا　　کعبہ کو کربلا تری تلوار نے کیا
(اسیر)

ترے موئے مشکیں بلا در بلا ہر اِک طرہ ہنگامۂ کربلا

(محسنؔ)

مرتے تھے یوں نہ تشنۂ دیدار آن کر قاتل گلی تھی آگے تری کربلا نہ تھی

(رندؔ)

قصیدوں سے مثالیں پیش کرنا طوالت کا باعث ہوگا۔ مگر ثبوت کے لئے یہ کہہ دینا کافی ہوگا کہ انیسؔ و دبیرؔ کے پہلے قصیدوں میں جو گھوڑوں، تلواروں کی تعریف ہوتی تھی اس میں ایک تبدیلی آگئی۔ غلو کم ہو کر قرین قیاس ہونے لگا۔ گھوڑا اصل گھوڑا اور تلوار واقعی تلوار معلوم ہونے لگی۔ قصیدہ پڑھنے والوں کو محسوس ہونے لگا کہ ہم اصلیت کے قریب ہیں۔ ناممکنات کی دنیا سے الگ ہو کر عالم امکان میں سانس لے رہے ہیں۔ اسی طرح رباعی کا بھی نقشہ بدلا۔ انیسؔ سے پہلے رُباعیوں میں نہ اتنا تنوع تھا نہ حسن، اور نہ شاید اتنا ذخیرہ، ان مرثیہ گویوں نے اس صنف کو زمین سے اٹھا کر آسمان پر پہنچا دیا۔ اہلِ نظر کو اس کی وسعت و جاذبیت کا اندازہ ہوا نتیجہ یہ ہوا کہ رباعی کی اشاعت ہمیشہ سے زیادہ ہوئی، ممکن ہے کہ یہ کہا جائے کہ مرثیہ گویوں کی جملہ رباعیاں واقعاتِ کربلا سے متعلق تو نہیں ہیں انھوں نے مختلف مضامین پر طبع آزمائی کی ہے۔ اس لئے رباعی کی ہمہ گیری کو واقعۂ کربلا سے کیوں متاثر سمجھا جائے؟ یہ بات اپنی جگہ پر صحیح ہے لیکن ذرا غور سے دیکھا جائے تو یہ رباعیاں اس لئے کہی گئی تھیں کہ مرثیہ یا دوسرے الفاظ میں واقعۂ کربلا کے لئے وہی کام کریں جو تشبیب قصیدہ کے لئے کرتی ہے۔ مرثیہ گو اسکو پس منظر کے طور پر مرثیہ پڑھنے سے پہلے سنا دینا ضروری سمجھتا تھا یہ رباعیات صرف مرثیوں کو سننے اور دلچسپی کے لئے کہی گئی تھیں۔ رباعیات کا سلسلہ اردو میں بہت پہلے سے چلا آرہا تھا مگر نہ اس میں تخیل کی اتنی بلندی تھی نہ اخلاق کی گہرائی۔ انیسؔ و دبیرؔ نے اس صنف کو ہمیشہ سے زیادہ وقار و متانت عطا کیا ——— ان شعراء کی رباعیاں تمام تر سنجیدگی و دنیاوی اقدار پر مبنی ہیں بلکہ یہ کہنا بے جا نہ ہوگا کہ مرثیہ گویوں کی بلندئ تخیل کا اندازہ صرف ان ہی رباعیوں سے ہوتا ہے مرثیہ چونکہ بیانیہ شاعری کا نمائندہ ہے۔ اسلئے

اس میں فلسفیانہ خیالات کی کارفرمائی زیادہ نہ تھی۔ رُباعی عمر خیام کے منہ لگی تھی جس نے معارف و حقائق کے دریا رباعیات میں بہا دیئے تھے۔ بعد کے فارسی و اردو شعرا بھی اس صنف میں زیادہ تر اونچی باتیں کہنے کی کوشش کرتے رہے۔ اردو میں یہ صنف کس مپرسی کے عالم میں پڑی تھی، غزل قصیدہ، مثنوی کے آگے اس غریب کو بہت کم دربارِ ادب میں آنے کی اجازت ملی، مرثیہ گویوں نے توجہ کر کے اس صنف کو مقبول اور ہر دلعزیز بنا دیا، جو باتیں وہ مرثیے میں کہہ سکتے تھے ان کو رُباعی میں پیش کرتے تھے، دنیا و عقبیٰ کے متعلق اپنے پاکیزہ جذبات، بلند خیالات اسی صنف میں پیش کرتے رہے۔ نتیجہ یہ ہوا کہ یہ صنف بھی ہمیشہ سے زیادہ ذی وقار و بلند پایہ ہوگئی۔

اصنافِ سخن میں سب سے زیادہ اثر مسدس پر واقعۂ کربلا کا پڑا۔ یہ صنف بھی مروجہ اصناف، غزل، قصیدہ۔ مثنوی کے آگے گمنام سی تھی۔ بہت کم شعراء نے عہدِ قدیم میں اس پر طبع آزمائی کی تھی۔ سوؔدا کے زمانے میں پہلی بار مرثیہ مسدس میں کہا گیا، کہنے والوں کو یہ محسوس ہوا کہ مرثیہ گوئی کی ترقی کے لئے اس صنف سے بہتر کوئی اور صنف نہیں۔ اب سے پہلے مختلف ہیئت میں مرثیے کہے جاتے تھے مگر اس دور سے زیادہ تر مرثیے اسی صنف میں کہے گئے۔

میر ضمیر کے عہد سے تو کلیتاً اسی شکل میں کہے جانے لگے۔ واقعات اور اندازِ بیان کو دیکھ کر ہر مرثیہ کہنے والے نے مسدس ہی کو اپنایا۔ انیسؔ و دبیرؔ نے اپنی فنکاری سے یہ ثابت کر دیا کہ بیانیہ شاعری کے لئے اس سے بہتر کوئی صنف نہیں۔ ان لوگوں نے مسدس کو ادبی دنیا میں ہمیشہ سے زیادہ وقیع اور سربلند کر دیا نتیجہ یہ ہوا کہ دورِ جدید میں جب اہلِ نظر کو مختلف مضامین قلم بند کرنے کی نظم میں ضرورت پڑی تو سب سے پہلے اسی صنفِ شاعری پر نظر پڑی اسی لئے واقعات و جذبات کو حدیث و آیات کو اس صنف میں مرثیہ گویوں نے اس کامیابی کے ساتھ پیش کیا تھا کہ اب اس شبہ کی کوئی گنجائش بھی نہ تھی کہ بدلے ہوئے زمانہ میں نئے مضامین و نئی قدروں کو اس شکل میں پیش کرنا دقت طلب بات نہ ہو۔ چنانچہ حالیؔ و اقبالؔ، برج نرائن چکبستؔ جیسے ممتاز شعراء نے

اپنی ابتدائی کاوشیں مسدس ہی میں پیش کرنا مناسب سمجھا۔ ادب میں ان بزرگوں کے شہ پارے اس مسدس کے ذریعے ہمارے سامنے آئے۔ بالواسطہ سہی مگر یہ بھی واقعۂ کربلا کا فیض تھا۔ نہ مرثیہ گو اس شکل کو روداد کربلا سے اجاگر کرتے اور نہ شعراء کے دور جدید میں اس پر نظر پڑتی۔ کہنا پڑتا ہے کہ

درد جگر کی داستاں آہ گئی کہاں کہاں
باغ میں گل ہے خوں چکاں شور ہے آبشار میں

واقعاتِ کربلا کا جو اثر اردو ادب پر پڑا اس کا یہ ایک خاکہ ہے جو ناقص بھی ہے نامکمل بھی، اس لئے کہ اس موضوع کو وضاحت کے ساتھ بیان کرنے کے لئے ایک مستقل کتاب کی ضرورت ہے۔ اور فی الحال نہ مجھے اتنی فرصت ہے نہ اس کتاب میں اتنی گنجائش کہ اس سے زیادہ لکھا جائے۔ اب آئیے اس کا بھی سرسری طور پر جائزہ لے لیا جائے کہ واقعات کربلا کا اثر صرف ادب ہی پر پڑا۔ کتاب ہی تک اس کی تگ و دو محدود رہی یا زندگی کے دوسرے پہلوؤں پر بھی کچھ اثر پڑا۔ اس سلسلے میں جب ہم غور کرتے ہیں تو ہندوستان میں واقعاتِ کربلا کے اثرات دو حصّوں میں نمایاں ہوتے ہیں ایک تو کتابی حیثیت سے سامنے آتا ہے دوسرا غیر تحریری پہلو سامنے آتا ہے۔ آپ کا جی چاہے ان حصّوں کو داخلی و خارجی کہہ لیجئے کہ بات پوری طرح واضح نہیں ہوتی مگر آسانیٔ بیان کے لئے مناسب ہے۔

داخلی حصّہ تو وہی ہے جس کا اوپر ذکر کیا جا چکا ہے۔ یعنی واقعۂ کربلا کا مرثیہ کی صورت میں آنا۔ خارجی حصّہ سے مراد فنونِ لطیفہ اور صنعت و حرفت کے بعض وہ پہلو ہیں جو براہِ راست واقعات کربلا سے متاثر ہوئے۔ اس ضمن میں رسوم کے ساتھ ساتھ اور بہت سی ایسی باتیں آگئیں جن کا زندگی سے تعلق تھا اور یہ سب واقعاتِ کربلا کے ردِّ عمل کا نتیجہ ہیں۔ شہدائے کربلا کی داستانِ خونچکاں ادب میں مرثیہ کہلائی، اور عمل میں اس کی ترجمانی کا نام محرم پڑ گیا۔ گویا واقعۂ کربلا کی دو اولادیں ہیں ایک مرثیہ دوسرا محرم اور دونوں لازم و ملزوم ہیں۔ جس طرح تلاوتِ قرآن کا موسم بہار ماہ رمضان المبارک ہے اسی طرح مرثیہ خوانی کا بہترین زمانہ محرم ہے۔ اسی زمانے کے لئے زیادہ تر مرثیے لکھے

اور ان ہی دس دنوں میں زیادہ پڑھے اور سُنے گئے۔ زیادہ سے زیادہ تعداد میں مومنین کا اجتماع مرثیہ سننے کے لئے انہی مخصوص ایام میں ہوا۔ محرّم ہی کی مجالس میں اس صنف پر اچھی یا بری رائے عوام و خواص نے دی لیکن بغیر مرثیے کے محرم بھی بے نمک کی دال معلوم ہوتی ہے۔ مرثیہ کی مختلف صورتیں یعنی سلام، سوز، رباعی وغیرہ مجالس و جلوس میں اگر نہ ہوں تو محرّم پھیکا پھیکا نظر آتا ہے۔ مگر یہ آجکی بات ہے۔ دورِ جدید سے ذرا پہلے زیادہ تر مرثیہ ہی رونقِ محرم کا سبب تھا اور آج بھی خاص مجلسوں کو نظر انداز کر کے عام مجلسوں کو دیکھا جائے تو نوحہ خوانی و سوز خوانی ہی سے محرّم چمکتا ہے، گھروں اور زنانی مجلسوں میں ہر جگہ اس کا بول بالا ہے۔ بات کہاں کی کہاں پہنچ گئی بتانا تو یہ تھا کہ مرثیہ کے دیگر اثرات زندگی کے مختلف شعبوں پر کیا پڑے اور میں کہنے لگا کچھ اور۔

ہاں تو میں یہ کہہ رہا تھا یا کہنا چاہتا تھا کہ محرّم واقعاتِ کربلا کے منانے کے لئے مخصوص تھا اس سلسلے میں مجالس و جلوس کو رونق دینے کے لئے مختلف پیرائے اختیار کئے گئے جن سے موسیقی۔ صنعت و حرفت، تعمیر وغیرہ پر خاطر خواہ اثر پڑا گویا محرّم یہاں کی سماجی زندگی کو ایک نئی روح دینے لگا جس کی قوت کا اثر مسلمانوں کے علاوہ ہندوؤں پر بھی پڑا بالواسطہ اور بلا واسطہ دونوں طرح ہندو مسلمان قریب تر ہونے لگے اسی قربت کا نتیجہ تھا کہ محرم منانے کے مقام کو عزاخانہ یا عاشور خانہ اور کوئی عربی فارسی نام دینے کے بجائے امام باڑہ کہا گیا اور یہی نام عام طور پر ہر دلعزیز ہوا۔ امام باڑے کی تشکیل نے فنِ تعمیر پر جو اثر ڈالا وہ بھی قابلِ ذکر ہے۔ محرّم منانے کے لئے ایسے مکان کی ضرورت ہوئی جہاں زیادہ سے زیادہ لوگ جمع ہو کر ذکرِ حسینؑ سے فیض یاب ہو سکیں عقیدت مندوں نے دل کھول کر ایسے مکان کی تعمیر و آرائش میں حصّہ لیا۔ ہر صاحبِ استطاعت مومن یہ چاہتا تھا کہ اس کے یہاں مجلس ہو محرم کے دس دن تک برابر مومنین آتے رہیں اس خواہش کی تکمیل کے لئے اس نے امام باڑہ بنوانا ضروری و کارِ ثواب سمجھا۔ تعمیرات کا سلسلہ شروع ہو گیا۔ جا بجا امام باڑے بننے لگے۔ بادشاہوں نے بھی دلچسپی کا ثبوت دیا اور بعض ایسے امام باڑے وجود میں آ گئے جو فنِ تعمیر کے لئے اضافہ ثابت ہوئے مثال کے

طور پر لکھنؤ میں آصف الدولہ کا بنوایا ہوا اور حیدرآباد میں قطب شاہ کا تعمیر کردہ امام باڑہ صرف اپنے عہد کی بہترین تعمیرات نہیں بلکہ آج بھی ان عمارتوں کا شمار دنیا کی بے مثل عمارتوں میں ہوتا ہے۔ خوشی اس بات کی ہے کہ امام باڑے بنوانے کا مذاق کسی ایک طبقے تک محدود نہیں رہا یہ تعمیری حس روز افزوں ہمہ گیری اختیار کرتی گئی۔ تاج محل فنِ تعمیر میں حرفِ آخر کی حیثیت رکھتا ہے اس کی تقلید عام نہ ہوسکتی تھی نہ ہوئی، مگر امام باڑے کی تعمیر ہر دیار میں ہوتی رہی اور صاحبِ عزا خانہ اپنے جمالیاتی ذوق کو اس تعمیر میں آسودہ کرنے کی فکر کرنے لگا زیادہ سے زیادہ اس کو حسین اور پائیدار بنانے کی کوشش کرتا رہا۔ بہترین صناع داخلِ دماغ نقش و نگار مرتب کرنے کے لئے تلاش کئے جانے لگے نتیجہ یہ ہوا کہ فنِ تعمیر سے دلچسپی لینا ایک عام بات ہوگئی جو لوگ امام باڑے نہ بنوا سکتے تھے وہ اپنی رائے اور پسندیدگی کا اظہار کرکے جمالیاتی حُسن کا ثبوت دیتے اور اس انہماک کے ساتھ تعمیر میں بغیر کسی اُجرت کے دلچسپی لیتے کہ گویا خود اپنا مکان بنوا رہے ہیں۔

امام باڑے کی تعمیر کے بعد اس کے سجانے کا سوال ہوتا ہے۔ علاوہ فرش و فروش کے جھاڑ فانوس۔ طغرے۔ علم کے بہترین پٹکے، پنجے امام باڑے کی آرائش کے لئے مہیا کئے جاتے۔ یہ سارا سامانِ آرائش بجائے خود ایک دفترِ صنعت تھا جس کو پایۂ تکمیل تک پہنچانے کے لئے بے شمار کاریگروں کی ضرورت پڑتی۔ محرّم اس بہانے ان کی ذہنی تربیت بھی کرتا اور گذر اوقات دسہارا بھی ثابت ہوتا۔ ہندوستان کا شاید ہی کوئی ایسا ذوق رہا ہو جس کی تکمیل میں عورت و مرد یکساں اتنی دلچسپی لیتے رہے ہوں امام باڑہ کی آرائش میں دونوں دوش بدوش اپنی کارگزاریوں سے جمالیاتی ذوق کی داد دیتے اور اس جذبے کے ساتھ کام کرتے کہ جس کی بنیاد دین پر ہے نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ اپنے مقدور سے زیادہ آرائش پر خرچ کرکے زیادہ سے زیادہ خوبصورت شکل میں امام باڑے کو مکمل کرتے۔ ہزاروں پنجے بنانے والے اور علم کے پٹکوں پر زردوزی کا کام کرنے والے مہیا کئے جاتے۔

امام باڑے اور محرم کا ایک جزو تعزیہ بھی ہے۔ کہا جاتا ہے کہ اس کی ابتداء

عہدِ تیمور سے ہوئی۔ رفتہ رفتہ اس کی شکل حسین ہوتی گئی۔ اس کی تشکیل میں دل و دماغ سے کام لیا جانے لگا۔ کاغذ کے بیل بوٹے، رنگ اور سنہرے نقش و نگار سے اس کو مزین کیا جانے لگا۔ تعزیہ داروں کو مسابقت کے جذبے نے روز بروز تعزیہ کو ترقی یافتہ صورت میں پیش کرنے پر آمادہ کیا۔ واقعاتِ کربلا کی یہ یادگار اس شہیدِ اعظم کی یاد دلاتی رہی جو بے گور و کفن کربلا میں پڑا رہا جس کو قبر بھی کئی دنوں بعد نصیب ہوئی۔ یہ تعزیہ اسی کے روضہ کی شکل پیش کرتا ہے۔ بعد میں امام حسینؑ کے روضہ پر عقیدتمندوں نے لاکھوں روپے لگا کر اسکو جاذب نگاہ اور رُوح بنا دیا۔ یہاں ہندوستان میں اس کی نقل پر جان نثاروں نے بے شمار روپیہ صرف کر کے تعزیہ کے کاغذی پیراہن کو فنکاری کا بہترین نمونہ بنا دیا اس کے بنانے والے ہر طبقہ کے لوگ ہوتے۔ ہندو مسلمان شیعہ سُنی غریب امیر سب ہی کسی نہ کسی وجہ سے اس کی ساخت اور ہیئت کو صنعت و حرفت کا جامہ پہنانے کی سعیِ مشکور کرتے۔ ریاست جے پور میں ہندو راجہ محرّم پر ہر سال لاکھوں روپیہ صرف کرتا۔ کاغذ کے علاوہ اس مردِ حق شناس نے ایک تعزیہ سونے چاندی کا بھی تیار کرایا جو آج تک محفوظ ہے۔ تعزیہ بنانے کے لئے دُور دُور سے کاریگر بلائے جاتے، پورے سال سال بھر لوگ تعزیہ کو مُشکّل کرنے میں مصروف رہتے۔ رفتہ رفتہ ایک جماعت اسکی ماہر ہوگئی۔ لیکن یہ فن کاری صرف ماہرین تک محدود نہ تھی۔ عوام و خواص سوچ سمجھ کر بازاروں میں، گھروں میں تعزیے بناتے رہتے۔ اس کے مختلف حصوں کو تخت سے لے کر گنبد تک بڑی دیدہ ریزی و صنعت سے تیار کر کے فن کا ایک مرقع بنا دیتے۔

تعزیہ کی ساخت و حُسن نے بنانے والوں میں جدت و تنوع کا ملکہ پیدا کر دیا تھا۔ اس کے قد کی بلندی و ضخامت کو جانے دیجئے کاغذ کو چھوڑ کر ایسے تعزیے بھی بنائے جانے لگے جو گیہوں اور جَو کے پودوں سے مرتب کئے جاتے تھے۔ ان پودوں کی ترتیب ایسی حُسن کاری کے ساتھ ہوتی کہ امام حسینؑ کے روضے کی شکل و ساخت ہو بہو نظروں میں آجاتی۔ اس کارگذاری کو آخری منزل تک پہنچتے پہنچتے مہینوں لگ جاتے مگر نہ پودوں کی تازگی میں فرق آتا نہ تعمیری حسن میں کوئی کمی رہ جاتی۔ واقعۂ کربلا کا یہ ادنیٰ

کرشمہ تھا کس نے اس قسم کی کاریگری کو ہندوستان میں اس انداز سے فروغ دیا کہ بغیر امتیازِ مذہب و ملت ہر جگہ اس سے ادنیٰ و اعلیٰ دلچسپی لینے لگا ۔۔۔۔۔۔ کتنے مزدوروں کاریگروں کی گذر اوقات کا ذریعہ حسینؑ کی بھوک و پیاس بن گئی ۔ دنیا نے دیکھ لیا کہ مردانِ خدا مر کے بھی اس طرح خاص و عام کی ذہنی و معاشی پرورش کرتے ہیں ۔

واقعۂ کربلا کا ایک اور اثر قابلِ ذکر ہے ۔ فنونِ لطیفہ میں موسیقی اہم درجہ رکھتی ہے ۔ باوجود شرعی قید و بند کے مسلمانوں نے ہندوستان میں اس فن کو زندہ رکھنے اور ترقی دینے کے لئے جو حصہ لیا وہ فنِ موسیقی کی ترویج و تجدید میں یہاں تک معاون ہوا کہ دنیا کو کہنا پڑا کہ اگر مسلمان اس فن سے غیر معمولی دلچسپی نہ لیتے تو شاید ہندوستان کی موسیقی ہمیشہ کے لئے زندہ درگور ہو جاتی ۔ باوجود ممنوع ہونے کے مذہب نے بھی موسیقی سے لگاؤ رکھنے کے لئے ایک نیا راستہ نکال لیا تھا ۔ قوالی کی ایجاد امیر خسرو نے کی ہو یا کسی اور نے بہر حال ایک فرقہ اس کو جائز سمجھ کر محفلِ حال و قال میں کھلے بندوں سنتا رہا اور موسیقی کی لہر خانقاہوں تک پہنچتی رہی لیکن یہ فرقہ محدود تھا اور اس سماع کا زمانہ بھی مخصوص تھا ۔ قوالی بذاتہ ، موسیقی کی ایک معمولی جھلک تھی جس کی وسعت ایک مخصوص نے اور راگنی تک محدود تھی ۔ موسیقی کے اہم و ممتاز راگ و راگنی تک ان کی رسائی نہ تھی ۔ محرم کے زمانے میں واقعات کربلا کو مختلف انداز سے پیش کر کے عوام کو متاثر کیا جاتا تھا ۔ حدیث خوانی ، مرثیہ خوانی ، نوحہ خوانی ، سوز خوانی یہ سب طریقے اپنی اپنی جگہ پر رائج تھے ۔ آخر الذکر انداز موسیقی سے تعلق رکھتا تھا ۔ سوز خوان منتخب راگ راگنی سے مرثیے سامعین تک پہنچاتا تھا ۔ رفتہ رفتہ اس کی دل کشی اتنی بڑھ گئی کہ لوگوں نے خوش گلوئی اور علم موسیقی سے واقفیت کا مطالبہ کیا ۔ سوز خوانوں کو موسیقی سے خاطر خواہ دلچسپی لینی پڑی اور ریاض کر کے ان لوگوں نے فنِ موسیقی میں مہارت حاصل کی اور ایسی واقفیت بہم پہنچائی کہ بعض سوز خواں ماہرِ فنِ موسیقی سمجھے جانے لگے ۔ موسیقی کے ہر شعبہ سے فائدہ اٹھا کر انھوں نے اپنے طور پر مرثیوں کو ترنم سے اس طرح دل کش بنایا کہ ان کی سوز خوانی فنکاری کا بہترین نمونہ سمجھی جانے لگی ۔

مجلسوں میں سوزخوانی کے رواج نے عام وخواص کو موسیقی سے دلچسپی لینے پر آمادہ کیا۔ باوجود اس کے مذہب نے موسیقی کو ممنوع قرار دیا تھا۔

مگر مرثیوں کا اس طرح پڑھا جانا لوگوں نے اتنا پسند کیا کہ نہ صرف شرعی احتساب کی سخت گیری کم ہوگئی بلکہ اچھے خاصے تقدس مآب حضرات بھی سوزخوانی سے دلچسپی لینے لگے۔ ظاہر ہے کہ جملہ انداز بیان سے یہ پیرایہ دلکش و عام پسند تھا اس لئے کہ راگ و راگنی ہر صاحب دل کی روحانی غذا ہوتی ہے، اس کی زیروبم دل کو براہ راست متاثر کرتی ہے۔ غمناک واقعات کو پراثر بنانے کے لئے ترنم سے زیادہ کوئی دوسرا انداز کارگر نہیں ہوسکتا۔ واقعاتِ کربلا سرتاپا غم واندوہ کا مرقع تھے۔ موسیقی وشعریت کا سہارا لے کر سوزخوانوں نے اسے اور زیادہ دردانگیز و پُراثر بنادیا۔ مومنین کو گریہ وبکا کا اور زیادہ موقع ملا۔ دل کے ساتھ ساتھ روح کو بھی تازگی محسوس ہوئی اس لئے سوزخوانی نوحہ ونغمہ کا امتزاج ثابت ہوئی۔ نتیجہ یہ ہوا کہ اس کی مقبولیت بڑھتی گئی لوگ موسیقی سے عام طور پر دلچسپی لینے لگے چونکہ مذہب یہاں خاموش تھا اس لئے اس پردہ میں موسیقی نے عورت ومرد سب کو متاثر کرکے اپنا دائرۂ اثر وسیع تر کرلیا۔

سوزخوانی کے ذریعہ موسیقی کی رسائی اس طبقہ میں بھی ہوئی جو کسی طرح اس فن کے قریب آنا بھی گوارا نہ کرتا۔ شریف سے شریف عورت مقدّس سے مقدّس مرد بھی اس کا گرویدہ ہوگیا۔ قریب قریب ہر شیعہ گھر میں عورتیں نوحہ خوانی کی مشق کرنے لگیں۔ اس طرح موسیقی دربار سے نکل کر درگاہ تک پہنچ گئی۔ مذہب کی سرپرستی حاصل ہوتے ہی اس کو احترام وتقدس کی نگاہوں سے دیکھا جانے لگا۔ گویا فنِ موسیقی اب معقول گھرانوں میں رسائی حاصل کرکے فنِ شریف کا درجہ حاصل کرنے لگا اور چاہے جو کچھ بھی ہو مگر اس انداز نے موسیقی کو عام پسند بنادیا اور اس کی ترویج واشاعت میں سوزخوانی نے جو حصہ لیا وہ مذہب کے لحاظ سے چاہے پسند نہ کیا جائے مگر فن کی مقبولیت اور ہردلعزیزی اس روّیہ کو احترام ووقعت کی نظر سے ہمیشہ دیکھتی رہی ہے۔

یہ اور اس قسم کے دیگر فنون وصنائع پر واقعاتِ کربلا مختلف ردِعمل کے ساتھ اپنا

اثر ڈالتے رہے۔ شجاعت، صنعت وحرفت، اخلاق غرض کہ ہر پہلو پر کچھ نہ کچھ اثر کا نشان ضرور ملتا ہے۔ خاص بات یہ ہے کہ باوجود مذہبی تخیل کے اس کا دائرۂ اثر کسی ایک طبقہ تک محدود نہ رہا۔ مسلمان وہندو، سرمایہ دار، مرد وعورت۔ سب ہی حسب استعداد واقعۂ کربلا سے فائدہ اٹھاتے رہے۔ کسی کا ایمان تازہ ہوتا رہا کسی کو روحانی غذا حاصل ہوتی رہی۔ کسی کو صنعت وحرفت کے پردہ میں کسب معاش کا موقع ملتا رہا۔ بہرحال واقعۂ کربلا عموماً اور محرم میں خصوصاً بلا امتیاز مذہب وملت سارے ملک کے لئے رحمت بن کر آتا اور سماجی زندگی کو ایسی تازگی بخش جاتا جس میں اشخاص، فنون ادب سب ہی توانائی محسوس کرتے۔

امام حسینؑ کی شخصیت و شہادت کا تجزیاتی مطالعہ

خواجہ غلام السیّدین

دنیا کی تاریخ ایک معنی میں انہی عظیم المرتبت عورتوں اور مردوں کے واقعات پر منحصر ہے جنہوں نے اس کے ارتقائی مدارج کو اپنے بڑے کارناموں سے یقیناً متاثر کیا ہے۔

ممکن ہے کہ بعض ممتاز مفکرین میرے اس قول سے اختلاف کریں اور کہیں کہ کارلائل کا یہ فلسفہ تاریخ فرد کو جماعت کے مقابلہ میں ناجائز رفعت دیتا ہے اس لئے کہ جماعت کا متفقہ زور ایک فرد یا افراد کے ایک زمرہ سے بدرجہا زیادہ ہوتا ہے اس بحث میں اختلاف کی گنجائش ہے لیکن اس سے شاید افراد اور جماعت کا وہ رابطہ نظر انداز ہو جاتا ہے جس کی وہ ایک کڑی ہیں۔ یقیناً تمام عظیم تاریخی شخصیتیں اپنے زمانہ اور ماحول کی پیداوار ہوا کرتی ہیں مگر یہ بات بدیہی ہے کہ ان بڑے مردوں اور عورتوں نے اکثر دنیا کے واقعات کے رُخ کو موڑ دیا ہے اور یہ ثابت کر دیا ہے کہ انسانوں میں کیا زبردست امکانات اچھائی اور برائی دونوں کے لئے پوشیدہ رہتے ہیں۔

جب خیالات اور تحریکوں کے دُور رَس دھارے غیر یقینی طریقہ سے تاریکی میں جاتے ہوتے ہیں۔ اور ان کی منزلِ مقصود غیر یقینی اور تذبذب کے عالم میں ہوتی ہے تو ایسے افراد پیدا ہو جاتے ہیں جن میں غیر معمولی قوت اور دُور اندیشی موجود ہوتی ہے اور وہ اسے صحیح رُخ پر لگا دیتے ہیں۔ ایسے تمام عظیم افراد پر جب غور کیا جائے تو معلوم ہو گا کہ انکی عظمت میں یہ امر مشترک ہے کہ ان میں سے ہر ایک نے اپنی زندگی اور آرام کو بنی نوع انسان کے لئے وقف کر دیا اور اس عظیم مقصد کو اپنی جان اور ذاتی فوائد کے مقابلہ میں کہیں زیادہ گرانقدر

سمجھا، غالباً وہ اپنی زندگی کا یہ مقصد سمجھتے تھے کہ انسان محض خوش رہنے کے لئے نہیں پیدا کیا گیا ہے، بلکہ جس چیز کو وہ حقیقی اور بیش قیمت سمجھتا ہے اس کی خدمت اور تکلیف کے لئے تکلیف اٹھانا اور صعوبت برداشت کرنا اس کا فرض ہے۔ اگر تاریخ وقتاً فوقتاً ایسی شخصیتیں نہ پیدا کرتی جو کہ اپنے عزم صمیم سے انسان کی روحانی اور اخلاقی زندگی کو سدھارتی رہیں۔ تو یقیناً انسانی زندگی پھر وحشی اور جنگلی قوانین کے ماتحت ہو جاتی۔ جہاں جذبۂ بہیمیت نہ کسی سماجی و اخلاقی اصول اور نہ دماغی رائے کا پابند رہ سکتا ہے۔ ان عظیم شخصیتوں کا کام بس یہ ہوتا ہے کہ وہ انسانوں کو عمدہ باتوں کی طرف راغب کریں۔ ان کو رفعت کی راہیں سوجھائیں اور ان کو ابتدائی بربریت کی طرف مائل ہونے سے مانع ہوں۔

دنیا کے بڑے شہداء کی فہرست میں امام حسینؑ عزت و شرافت کی ایک بڑی منزل پر فائز ہیں۔ انھوں نے سائنس کے کسی مسئلہ کی تحقیق نہیں کی تھی۔ کوئی نیا ملک دریافت نہیں کیا تھا اور نہ کسی نئے مذہب کی بنیاد رکھی تھی وہ عام معنی میں کوئی بڑے فاتح یا مدبر و منتظم بھی نہ تھے۔ انھیں معمولی دماغ والا ذہن ایک معمولی انسان سے زیادہ وقعت نہیں دے سکتا جنہوں نے کہ مٹھی بھر جماعت کے ساتھ ایک لاتعداد فوج کے مقابلہ میں شکست کھائی ہو اور سلطنت سے ہاتھ دھویا ہو۔

جب یہ بات واضح ہوگئی کہ دنیا کے عظماء کی خصوصیات میں سے کوئی خصوصیت اُن میں نہیں پائی جاتی تھی تو پھر اب ایک سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ کیا سبب ہے کہ بعد کی تمام نسلوں کی نظر میں ان کو عزت و احترام کا استحقاق حاصل ہوگیا ہے؟ انھوں نے دنیا کو بہادری اور بڑائی کا کونسا نیا سبق دیا ہے۔؟ میرا پورا مقالہ اسی سوال کا جواب ہے اور میں نے اس باب میں کوشش کی ہے کہ اختصار کے ساتھ ان تمام باتوں کو واضح کردوں جو کہ ان کی بزرگی و شرف کے عمود ہیں۔

کسی تاریخی شخصیت کی عظمت کا اندازہ لگانے کے لئے ہمیں دو باتوں کا جواب ملنا چاہئے۔ پہلے تو یہ کہ اس مقصد کی نوعیت کیا تھی جس کے حاصل کرنے کے لئے اس نے اپنی جان دیدی؟ دوسرے یہ کہ اس کے کردار کے اخلاقی و ذاتی خصوصیات کیا تھے جن کو

اس نے اپنے مقصد کے حصول میں صرف کیا۔ یہ دو سوالات اس کی قربانی کی صحیح عظمت معیّن کر دیں گے۔

اگر ہم اس کی قربانی کے اخلاقی پہلو کو نظر انداز کر دیں تو چنگیز خان کی خونی فتح، ایک منجّم کے ایک نئے ستارے کو معلوم کرنے یا ایک ڈاکٹر کی تحقیق کے بعد کسی مرض کی دوا معیّن کرنے سے زیادہ عظیم نہ رہ جائے گی۔ اگر افراد کے کردار کو زیرِ غور نہ رکھیں تو اچھے اور بُرے وسائل میں امتیاز مفقود ہو جائے گا۔ اور ہم مانی والے اخلاقیات کو ماننے پر مجبور ہوں گے۔ ________ لیکن جہاں انجام اخلاقی حیثیت سے ممدوح ہے اور وسائل معزز ہیں تو اس وقت انسانی کوشش بہت عظیم ہو جاتی ہے اور انسان ہمیشہ بڑھتے ہوئے تخلیقی امور میں خدا کا معاون کار ہو جاتا ہے۔

اب آؤ حسینؑ کو اس معیار پر جانچیں۔ آخر حسینؑ نے کیوں اتنی بڑی قربانی پیش کی؟ صرف اپنی ہی جان کی نہیں اس لئے کہ یہ تو مقابلتاً آسان ہے بلکہ اپنے اعزا و اقربا کی بھی۔ اس ہمت و جوانمردی کے ساتھ جواب بھی انسانی تاریخ میں عدیم المثال ہے۔ آئندہ صفحات کا مطالعہ جس میں واقعات کے ضمن میں تاریخی خلاصہ بھی دیا گیا ہے۔ اس بات کو واضح کر دے گا کہ حسینؑ نے میدانِ کربلا میں یہ تاریخی جنگ ان تمام خوبیوں کے تحفظ میں کی جس کی عزت سمجھدار آدمی ہر زمانہ میں کرتے رہے ہیں۔ مذہبی مسلمانوں کی نظروں میں حسینؑ استحکام و تحفظِ اسلام کے لئے جنگ کرتے ہوئے دکھائی دیتے ہیں۔ اس ناپاک اور بے دین حکمران کے خلاف جو نہ محض خلیفۃ المسلمین بن جانے کی دھمکی دیتا تھا بلکہ مسلمانوں کا رہبر بن بیٹھا تھا اور اسلام کے صاف چہرے میں اپنی ذاتی خرابیوں اور ناپاک سماجی و سیاسی اصولوں کا دھبہ لگانا چاہتا تھا۔

آؤ دیکھیں کہ اسلام کے لئے جنگ کا مطلب عرفِ عام میں یعنی مسلمانوں اور تمام خدا ترس انسانوں کے نزدیک کیا ہے۔ جس کے لئے حسینؑ نے ایسی بے نظیر قربانی پیش کی۔ اس پر غور کرنے کے بعد ہم اندازہ کریں گے کہ حسینؑ ساری دنیائے انسانیت کے لئے کیا پیغام دیتے ہیں۔ جس میں مذہب و ملت کی تفریق نہیں ہے۔

پہلی بات تو یہ ہے کہ حسینؑ نے انسانی ضمیر کی آزادی کے لئے مقابلہ کیا جو کہ ہر انسان کا فطری حق ہوا کرتا ہے ۔ یزید سیاسی اقتدار کو غصب کر چکا تھا اور رشوت دباؤ اور قوت سے اس نے تمام لوگوں سے بیعت لے لی تھی۔ سوائے حسینی جماعت کے، جن لوگوں نے مجبوراً یزید کو خلیفہ تسلیم کیا تھا انھوں نے گویا ظلمت کی قوتوں سے سمجھوتہ کر لیا تھا۔ حسینؑ رسولؐ کے نواسے اور اپنے کردار کی ذاتی خوبیوں اور راستبازی کے سبب بے حد معزز تھے اور ہمیشہ بھلائی کے لئے کوشاں رہا کرتے تھے۔ جب تک کہ وہ یزید کی بیعت نہ کر لیتے یقیناً وہ اپنے کو محفوظ نہیں سمجھتا تھا۔ برائی اور ظلم کو جوع البقر ہوتی ہے۔ یعنی ایسی بھوک جو کہ تمام اچھائیوں اور برائیوں کو نگل جائے۔ یزید نے اب حسینؑ کے سامنے بیعت کا مسئلہ رکھا یعنی یہ کہ وہ اس کی دینی اور دنیوی خلافت کو تسلیم کر لیں۔ جس کا مطلب ان تمام ذاتی اصولوں اور اخلاقیات کا ترک کر دینا تھا جو کہ حسینؑ کو عزیز تھے یا پھر وہ یزیدی فوج کے مقابلہ کے لئے تیار ہو جائیں۔ جس کا نتیجہ بہت ممکن ہے کہ یہی ہو کہ حسینؑ اور اُن کے انتہا سے زیادہ عزیز اور وفادار ساتھیوں کو موت کا مزہ چکھنا پڑے۔ حسینؑ نے تامل نہ کیا۔ ضمیر کی آواز حسینؑ کے لئے زیادہ قوی تھی۔ بہ نسبت ان تمام خوفناک نتائج کے جو کہ ایک سیاسی شکست کے بعد میدانِ جنگ میں برداشت کرنا پڑے۔ وہ اپنے زمانہ والوں اور آئندہ نسلوں کو یہ بات سمجھا دینا چاہتے تھے کہ اپنا ذاتی تحفظ و آرام عزیزوں اور دوستوں کی سلامتی اور متعلقین کی فطری محبت کوئی بھی حق کی خاطر لڑنے کے سامنے وقعت نہیں رکھتی۔ کیا آج جبکہ اس دنیا میں ظلم و تشدد بڑھا ہوا ہے اس کے لئے حسینؑ کی مثال سے زیادہ کوئی مثال ہو سکتی ہے۔ جنھوں نے ثابت کر دیا ہے کہ بُرائی کا کیونکر ہر قیمت پر مقابلہ کیا جا سکتا ہے اور ان قوتوں کو شکست دینے میں بڑی سے بڑی قربانی سے بھی دریغ نہیں کیا جا سکتا۔ حسینؑ کی مثال حق و انصاف کے مجاہدین کے لئے ہمیشہ منارۂ نور رہی ہے۔

دوسری بات یہ ہے کہ حسینؑ فردِ واحد کے ضمیر کے نمائندے نہیں تھے۔ بلکہ ان تمام سماجی رجحانات کے نمائندہ تھے جن کا نتیجہ آزادیٔ قوم ہے۔ یزید جمہور کا نمائندہ

ہونے کی حیثیت سے تخت نشین نہیں ہوا تھا بلکہ ظلم اور مطلق العنان قوت کی وجہ سے حصولِ خلافت میں کامیاب ہوا تھا۔ وہ ان تمام شہری اور تمدنی آزادیوں کا باغی تھا جنہیں اسلام نے ہر فرد کا ورثہ قرار دیا تھا۔ رسول کی تعلیم کردہ مساوی زندگی کو جسے اسلام کے سچے پیرووں نے شعار بنالیا تھا۔ ذلیل و حقیر کرنے کے لئے اس نے کھلم کھلا عیش و عشرت میں بسر کرنا شروع کیا اور اسلام کے تعلیم کردہ سماجی اور اقتصادی مساوات کا مضحکہ اڑاتا تھا۔

حسینؑ کی شہادت یزیدی حکومت کی ان تمام باتوں کے خلاف ایک صدائے احتجاج تھی اور اس نے یقیناً سماجی اور سیاسی زندگی میں انصاف کے اصول کی اہمیت کا پھر سے احیاء کر دیا ان تمام لوگوں کے لئے جو کوشش کرتے ہیں یا جنھوں نے کوشش کی ہے یا جو آئندہ کوشش کریں گے کہ عام انسانوں کے لئے بہترین زندگی کا معیار بن جائے ان سب کے لئے حسینؑ کی آزادی اور حقوقِ جمہور کے لئے بے تعلق جنگ کی مثال یقیناً مشعلِ ہدایت ہوگی۔

تاریخ میں اور بھی اچھے اور سچے انسانوں کی نظیریں موجود ہیں جنھوں نے خاص مقاصد کے لئے کوشش کی ہے اور یقیناً وہ ہمارے عزت و احترام کے مستحق ہیں۔ لیکن حسینؑ کی قربانیوں اور کارناموں کو لاثانی بنادینے والے عناصر کون ہیں؟ جس چیز نے حسینی قربانی اور عمل کو عدیم المثال بنادیا ہے وہ حق کو قوت پر فتحمند بنانے کے لئے ایک ایسا غیر معمولی طریقۂ کار ہے جو حسینی سیاست و تدبر کی جان ہے۔ اس تاریک زمانے میں بھی حسینؑ کا اثر لوگوں کے دلوں میں تھا۔ ہزاروں آدمی جنھوں نے رسولؐ کو دیکھا تھا اور انکی خدمت میں رہے تھے انھوں نے رسول کی حسینؑ سے انتہائی محبت کا مشاہدہ کیا تھا۔ اگر حسینؑ اپنے اثر و قوت کو یزید کے خلاف ایک فوج جمع کرنے میں صرف کرتے تو کوئی وجہ نہیں معلوم ہوتی کہ وہ اپنے مقصد میں کامیاب نہ ہوتے اگر وہ اپنی جنگ میں عسکری سیاست اور مکر و فریب کو دخل دیتے اور بہر صورت فتح حاصل کرنا چاہتے تو جنگ کے لئے جو طریقہ انھوں نے اختیار کیا تھا یقیناً اس سے مختلف طریقے پر اُن کی جنگ ہوتی۔ انھوں نے فوج جمع کرنے کی کوئی تدبیر نہیں کی تھی۔ انھوں نے اس امر کو پوشیدہ رکھنے کی بھی کوشش نہیں کی تھی کہ مقابلہ ایک لشکرِ جرار

سے ہوگا اور وہ اس میں قتل ہوں گے۔ انھوں نے اپنے ساتھیوں کو دورانِ سفر کئی بار متنبہ بھی کیا تھا کہ وہ ان کا ساتھ دے کر اپنے آپ کو ہلاکت میں نہ ڈالیں۔ شبِ عاشور کو بھی انھوں نے اپنی مٹھی بھر فوج کو جمع کر کے ایک مؤثر تقریر کی اور کہا کہ "اے بہادرو! دیکھو میرا ساتھ دینے میں ایک نہایت تکلیف دہ اور یقینی موت کا سامنا کرنا ہے۔ لہٰذا جسے جانا ہے وہ پردۂ شب میں کسی حفاظت کی جگہ پر چلا جائے۔ انھوں نے شمع بھی گل کر دی تاکہ جس کو پہلے جانے میں تامل ہو رہا ہے وہ اب چلا جائے۔ کسی نے سنا ہے ؟ کہ ایک لشکرِ جرار کے مقابلہ میں کوئی سپہ سالار اپنی فوج کی تعداد کو ہر ممکن طریقہ سے برابر گھٹا ہی رہا ہو۔

دوسرا عنصر جو اس سپہ سالار میں حیرت خیز ہے وہ یہ کہ دوسروں کو تو وہ اپنا ساتھ دینے سے منع کرے لیکن اعزا و اقربا کو ایسے خطرناک سفر میں ساتھ ساتھ رکھے یعنی اپنی بیوی بہنوں، بیٹیوں، بیٹوں۔ بھائیوں۔ بھانجے۔ بھتیجے۔ بھتیجیوں وغیرہ کو، کسی نے سنا ہے ؟ کہ بے حد محبت کرنے والا باپ اپنے بیٹوں حتیٰ کہ شش ماہہ بچہ کی بھی زندگی کو خطرے میں ڈال دے کسی نے سنا ہے ؟ کہ ایک چاہنے والا شوہر اور بھائی اپنی بیوی اور بہن کو معرضِ خطر میں خود سے لا کر چھوڑ دے ؟ مگر یہاں تو جنگ کی نوعیت ہی دوسری تھی وہ کوئی عسکری فتح یا حفاظتِ جانی کے طالب نہ تھے بلکہ یزید نے موجودہ اور آئندہ اسلامی دنیا کو جس نازک حالت میں کر دیا تھا اس کا مقتضیٰ ہی یہ تھا کہ قربانی نمایاں اور تمثیلی ہو۔

اگر حسینؑ قوت اور فوج ہی سے فتح کے طالب ہوتے تو آج تاریخ واقعۂ کربلا کو اس سے زیادہ اہمیت نہ دیتی کہ دو فریقوں میں جنگ ہوئی جن میں سے ایک کو فتح اور دوسرے کو شکست ہوئی اور اس طرح اس معرکہ کی اصل نوعیت ہی ختم ہو جاتی اس میں ساری دنیا والوں کے ضمیروں کو انتہائی درجہ متحرک کر دینے کی صلاحیت ہی باقی نہ رہتی۔ اگر وہ جنگ کی طرح سے جنگ کرتے یعنی اپنے ساتھ مضبوط اور قوی سپاہیوں کو لڑاتے اور قتل کرا دیتے تو اس وقت لوگ ان کی جنگ کو ایک عام جنگ سمجھتے اور انتہائی اثر جواب ہے ہرگز باقی

نہ رہتا۔ اس لئے موقعہ حسینؑ سے اس امر کا متقاضی تھا کہ قربانی بہت نمایاں اور تمثیلی ہو۔ تاریخ کسی زمانے میں ہمیں کسی دوسری ایسی جنگ کا پتہ نہیں دیتی۔ جس میں اتنی بلند اتنی متنوع اور اتنی دلگداز قربانیاں حق وصداقت کی حمایت میں جان بوجھ کر اور اپنی خواہش سے پیش کی گئی ہوں۔ دیکھو اس جنگ کے لڑنے والے کیسے تھے؟

کچھ تو بڈھے تھے جو پیرانہ سالی کے سبب دُہرے ہو گئے تھے۔ کچھ جوان تھے جو اپنی زندگی کے شباب پر تھے کچھ بچے تھے جو ابھی سن بلوغ تک بھی نہیں پہنچے تھے۔ بہرحال ان میں عزیز و اقارب دوست، بڈھے، جوان۔ بچےّ سب ہی موجود تھے اور قربانی کا وہ حوصلہ تھا کہ ہر ایک اپنے آقا پر جان نثار کرنے کے لئے ایک دوسرے پر سبقت کرتا تھا۔ جب عرب کی بہادری کا یہ پھول کھلانے لگا اور قربانی کے لئے کوئی فدیہ راہ خدا میں باقی نہ رہا تو شش ماہہ اصغر نے بھی ننھے مجاہد کی طرح اپنے کو پیش کیا تاکہ دنیا پر روشن ہو جائے کہ یزیدی فوج صرف حسینؑ کی دشمن نہ تھی بلکہ تمام عمدہ انسانی ہمدردیوں اور انسانی جذبات کی بھی دشمن تھی اور ان تمام شدائد و تکالیف کے درمیان جن کو چشم فلک نے کبھی نہ دیکھا ہوگا۔ حسینؑ ایک چٹان کی طرح مستقل رہے جن کو ہم مافوق البشر بھی کہہ سکتے ہیں۔

اگر حسینؑ کے علاوہ کوئی دوسرا انسان ہوتا اور اُس پر ان مصائب کا عشر عشیر بھی پڑتا تو اس کے حواس گم ہو جاتے اور ارادہ میں تزلزل پڑ جاتا لیکن حسینؑ نے اس میدان میں جو بازیاں لگائی تھیں وہ نہایت بلند تھیں۔ یعنی وہ اسلام اور انسانیت کیلئے تھیں اور یہ سب قربانیاں اصل مقصد کا جزو لاینفک تھیں۔ ان تیزی کے ساتھ بڑھنے والی تباہیوں کے سامنے بھی حسینؑ نے ان تمام بلند انسانی خوبیوں کا مظاہرہ کیا جو ایک بہت بڑے آدمی کا طرۂ امتیاز ہوا کرتی ہیں یعنی محبت، وفاداری، اصابتِ رائے، حُسن گفتار و کردار۔ عبادت خدا اور بنی نوعِ انسان کے حقوق کی مراعات اور اس کے ساتھ مافوق البشر ہمت و استقلال کا وہ مظاہرہ کیا جس کی نظیر مفقود ہے یقیناً سانحۂ کربلا کا ایک ایک واقعہ اخلاقیات کا ایک ایک سبق اور انسانی شرافت و بہادری کی غیر معمولی رفعت کا ثبوت ہے۔

جب ظہر کے وقت اُن کے وفا شعاروں کے نخلِ حیات قطع ہو گئے اور وہ برگِ خزاں رسیدہ کی طرح ایک ایک کر کے زمین پر گر گئے تو حسینؑ نے اپنی موت کا سامنا کرنا چاہا، اس ہمت اور مستقل مزاجی کے ساتھ جو تخیل کو دہشت میں ڈال دیتی ہے۔ جو چیز اور بھی قابلِ تعجب ہے وہ یہ ہے کہ ایسے نازک اور جاں گسل موقع پر بھی حسینؑ اپنی بلند طبعی اور خصوصیتِ منصبی کے محافظ رہے اور ان کا نفس اس حد تک ان کے اختیار میں رہا کہ وہ اپنے قاتلوں کے لئے بھی اپنے دل میں جگہ رکھتے تھے۔ یہاں تک کہ انھوں نے اپنے دشمنوں کی برائی نہیں چاہی اور ان کے لئے بددعا نہیں کی بلکہ کہا جاتا ہے کہ جب ظالم اور بے رحم شمر خنجر لئے ہوئے امام کے سر و تن میں جُدائی کر دینے کے لئے بڑھا تو اُس نے دیکھا کہ امام سجدے میں ہیں اور خشک ہونٹ خالق کی بارگاہ میں مناجات کر رہے ہیں وہ سمجھا کہ حسینؑ اپنے دشمنوں کے لئے بددعا کر رہے ہوں گے لیکن جب اس نے جھک کر سنا تو حسینؑ جن کی تربیت اور ورثہ نے انسانِ کامل کا نمونہ بنا دیا تھا۔ وہ خدا کی بارگاہ میں یہ دُعا کر رہے تھے کہ "اے خدا تو رسول کی اُمت کو صراطِ مستقیم کی ہدایت فرما اور انکو بخش دے" کائنات کا دل حیرت و تعجب کے عالم میں ہو گا جبکہ قاتل کے خنجر کے نیچے جانکنی کے عالم میں حسینؑ کی زبان سے دعائے مغفرت کے یہ کلمے نکل رہے ہوں گے۔

حسینؑ کی تکلیفیں موت کے بعد ہی ختم نہیں ہو گئیں۔ حسینؑ کے پسماندگان جن میں سب بچے اور عورتیں ہی تھیں سوائے ایک بیٹے کے جو عرصہ سے بسترِ بیماری میں پڑا تھا، جس کو اور بھی زیادہ مصائب کا سامنا کرنا پڑا۔ وہ قیدیوں کی طرح در بدر پھرائے گئے اور خلیفہ کے خلاف بغاوت کرنے کے جرم میں ان کی تشہیر کی گئی۔ اس طرح ان مخدراتِ باعصمت نے بھی جو کہ رسولؐ کی بہوئیں، پوتیاں اور نواسیاں تھیں گھر بار کو چھوڑ کر اپنے امام اور خاندان کے سرتاج کے مقصدِ قربانی میں اشتراکِ عمل کیا۔ جب یہ قافلہ در بدر پھرایا جا رہا تھا تو لوگوں میں ان معصوم اور بے گناہوں کی حالت دیکھ کر خلیفۂ وقت کے خلاف اشتعال پیدا ہوا تھا۔ جو لوگ یزید کی مملکت میں پناہ گزین تھے یا جن میں اسکے مظالم کے خلاف صدائے احتجاج بلند کرنے کی ہمت موجود نہ تھی ان میں بھی جرأتِ اظہار

پیدا ہوگئی۔

اس طریقے سے حسینؑ کی میدانِ جنگ میں نمایاں قربانیوں نے اوران کے اہلِ بیت کے ان مصائب نے وہ آگ لگا دی جس نے چند ہی سال میں یزیدی قوت کے ناپاک ایوانِ سلطنت کو جلا کر خاکستر کر دیا اور جس نے یزیدیت کو ہمیشہ کے لئے ظلم و برائی کا مترادف بنا دیا اور یزید کو جو کہ اسلام کے فنا کرنے کے لئے اٹھا تھا۔ شہادتِ حسینؑ نے نہایت عمدہ طریقے سے ہمیشہ کے لئے فنا کے گھاٹ اتار دیا۔ اس طرح حسینؑ نے شکست کے بعد فتح حاصل کی۔ ان شہداء کے خون سے از سرِ نو رفعت پیدا ہوئی اور اس کے اخلاقی وسماجی اصولوں کی نمائش ہوئی۔ کیا ان تمام واقعات سے حسینؑ کا جو خاکہ ہمارے دماغ میں آگیا ہے اس میں اور کچھ زیادہ رنگ آمیزی کرنے کی ضرورت باقی رہ گئی ہے۔ ہم یہ کہہ سکتے ہیں کہ حسینؑ نے تاریخ میں شرافت اور بہادری کا ایک نیا باب کھول دیا ہے اور اپنے کردار اور کارنامے کا وہ نقش مرتسم کر دیا ہے کہ اگر ہم اسے پورے طور پر سمجھ لیں تو حیران رہ جائیں۔

ان کی شخصیت کا مطالعہ ہمیں بتاتا ہے کہ زندگی حقیقتاً انسان کی آزاد مملکت نہیں ہے بلکہ خدا کا ایک مستعار عطیہ ہے۔ انسان اس سے اپنی خواہش کے مطابق کام لینے کا حق نہیں رکھتا۔ اسے خدا کی راہ میں صرف کر دینا چاہئے۔ یعنی بلند مقاصد کے حصول میں، انسان عیش وعشرت کے لئے پیدا نہیں ہوا بلکہ کوشش کرنے کے لئے تکلیف اٹھانے کے لئے۔ اور بنی نوعِ انسان کی خدمت کرنے کے لئے، حسینؑ نے باوجود اس کے کہ وہ عیش وعشرت کی زندگی پر قدرت رکھتے تھے۔ اپنے لئے فقر و فاقہ کی زندگی قبول کی، انھوں نے غلبہ واستبداد کی زندگی کے بجائے جس پر وہ قادر تھے۔ اپنے لئے خدمتِ خلق کو عزیز رکھا۔ دن رات عزاداء اور مصیبت زدوں کی تکلیفوں کو دور کرنے میں صرف کیا اور اپنے لئے ایسے آرام کو حرام سمجھا جو غریب سے غریب انسان کو بھی میسّر نہ ہو۔ ان میں انتہائی بلند قسم کی ہمت تھی۔ جسمانی اور روحانی دونوں۔ جسمانی یوں کہ انھوں نے سخت دھوپ، بھوک اور پیاس برداشت کی اور پھر میدانِ کارزار میں جہاد کیا۔ روحانی ہمت یوں کہ خدا کی راہ میں اپنے اعزا و اقرباء کی جان سے بھی

دریغ نہ کیا۔ ان میں وہ ہمت تھی کہ انھوں نے تن تنہا خباثت کی صف آراء فوج کا مقابلہ کیا۔ وہ ایسی ہمت کے مالک تھے جو اعلانِ کلمۃ الحق میں بیباک تھی اور سب سے بڑھ کر ان کی محبت کی مثال یہ تھی کہ انھوں نے موت کا ایک بچھڑے ہوئے دوست کی طرح استقبال کیا۔ وہ کہا کرتے تھے کہ عزت کی موت ذلت کی زندگی سے بہتر ہے۔

شہادتِ حسینؑ کا نفسیاتی پہلو

سید احتشام حسین

دنیا اس واقعہ سے کسی نہ کسی عنوان سے واقف ہے کہ فلسفیوں کے دماغ نے شاعروں کے قلم نے اور بڑے بڑے ادیبوں نے اس واقعہ کے بارے میں بہت کچھ کہا ہے۔ میں خاص طور سے ایسی بات نہ کہوں گا جو اس واقعہ میں کوئی انوکھا پہلو ظاہر کر سکے۔

میں عرض کرنا چاہتا ہوں کہ واقعۂ کربلا میں جو انفرادی واقعات پیش آئے تھے، اُن میں کوئی خاص اہمیت نہیں تھی۔ پانی لوگوں پر بند ہوتا ہے۔ چھ مہینوں کے بچوں نے جانیں دی ہیں۔ اٹھارہ برس کے جوانوں نے دم توڑا ہے اور عورتیں قید کی گئی ہیں دنیا کی تاریخ اس کو پیش کر سکے گی۔ اس وقت جنگ کے شعلے ساری دنیا کو گھیرے ہوئے ہیں۔ آج بھی ایسے واقعات پیش آ رہے ہیں۔ جب ہم کہتے ہیں کہ واقعۂ کربلا سب سے انوکھا واقعہ ہے تو دوسری کیفیت ہوگی۔ صرف یہی نہیں کہ بہتر (۷۲) انسانوں نے مقابلہ کر کے بوڑھوں اور بچوں نے ایک ہی رشتہ پر جانیں دے دیں۔ حقیقت یہ ہے کہ ان کے رہنما اور واقعۂ کربلا کے ہیرو حضرت امام حسینؑ کی زندگی ہمارے سامنے آکر اپنی طرف متوجہ کرتی ہے

حضرت امام حسینؑ کی عمر کربلا میں ۵۷ سال کی تھی۔ اس عمر میں خیالات پختہ ہو جاتے ہیں۔ خواہشات میں استحکام ہوتا ہے۔ جو بات انسان کرنا چاہتا ہے۔ سوچ سمجھ کر قدم اٹھاتا ہے۔ اس عمر میں اگر کوئی میدان میں سر دینے کے لئے آمادہ ہوتا ہے تو یہ جان کر آتا ہے کہ کیا کرنے جا رہا ہے۔ یہ خودکشی کی منزل نہیں ہوتی۔ حقیقتاً دماغ اور دل ایک ساتھ سوچتے ہیں، احساسات اور دماغ کی طاقتیں ایک ساتھ کام کرتی ہیں۔ انسان ایک

رد میں کام نہیں کرسکتا۔ ایک ادنیٰ انسان بھی ۷۵ برس میں پختہ کار سمجھا جاتا ہے۔ حسینؑ نے آنکھیں بند کر کے ۵۷ سال نہیں گذارے تھے بلکہ وہ ایسے واقعات اور حادثات سے بھرے ہوئے تھے کہ نہ صرف عرب کی تاریخ نے بلکہ دنیا کی تاریخ نے پلٹے کھائے تھے۔ حسینؑ کی عمر سات سال کی تھی جب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے انتقال کیا وہ ہر علم کو حاصل کرنے کی عمر تھی۔ اگر آپ علم نفسیات کے جاننے والے سے پوچھیں کہ بچپن میں ذہنیت کس طرح سے بنتی ہے تو آپ کو معلوم ہوگا کہ سات برس کی عمر ایسے نقش لے لیتی ہے۔ ایسی باتوں کو سمجھ لیتی ہے اور ایسی باتوں کو صاف دیکھ لیتی ہے جو عام طور سے جوان نہیں دیکھتے۔ سات برس کے بنے ہوئے نقش مرتے دم تک قائم رہتے ہیں۔ رسول اللہ نے پورے اعتماد سے یہ کہا ہوگا کہ حسینؑ مجھ سے ہے اور میں حسینؑ سے ہوں۔ حسینؑ ان الفاظ کو نہیں بھولے۔ لیکن کربلا میں جو شہید کرنے آئے تھے وہ بھول گئے تھے۔ جو تیروں سے حملے کر رہے تھے۔ جنھوں نے دریا پر پہرے لگا رکھے تھے۔ وہ بھول گئے تھے جو پورے خاندان کو برباد کرنے کا بیڑا اٹھا کر آئے تھے وہ بھول گئے تھے۔ حسینؑ نے سات برس میں جو آوازیں سنی تھیں۔ جو مناظر دیکھے تھے انھیں اپنے دماغ پر نقش کر لیا تھا۔ جب رسول اللہ نے انتقال کیا۔ اسوقت کو کبھی نہیں بھولے۔ جب فاطمہؑ نے انتقال کیا۔ جب علی نے دم توڑا۔ اسوقت سے بھی واقف تھے۔ جب ان کے بھائی حسنؑ دنیا سے رخصت ہوئے اس کو بھی نہیں بھولے، موقعہ کے منتظر تھے کہ کونسا وقت آئے گا کہ میں رسول اللہ کی اس بات پر عمل کرسکوں کہ میں حسینؑ سے ہوں اور حسینؑ مجھ سے ہے" میں عرض کرنا چاہتا ہوں کہ پچاس سال کی کاوش کا نتیجہ تھا کہ حسینؑ نے کربلا کے میدان میں اس کو پورا کر کے دکھا دیا۔ یہ دیکھنے کی بات ہے کہ رسول اللہ کتنا بھروسہ رکھتے تھے حسینؑ پر۔ میں عرض کروں گا کہ سات برس کے بچہ کے لئے یہ معمولی جذبات اور معمولی دماغ کا نتیجہ نہیں تھا۔ رسول اللہ اس بچہ میں وہ عادتیں پیدا کر گئے تھے کہ جو آگے بڑھ کر ان کو دنیا کا نجات دہندہ بنانے والی تھیں اس لئے اس علم کے ساتھ رسول اللہ نے کہا تھا کہ حسینؑ مجھ سے ہے اور میں حسینؑ

سے ،جس کے کانوں میں یہ آواز پہنچا دی گئی تھی وہ کیسے بھول سکتا تھا۔ حسینؑ نے اس کو یاد رکھا۔ اس کو یاد رکھ کر پچاس برس کی عمر اس کوشش میں صرف ہوئی کہ اس کو عظیم تر بنا کر دنیا کے سامنے پیش کرے۔ اس کا موقعہ بارہا آچکا تھا صفین کے میدان میں حسینؑ کی تلوار چمک چکی تھی اور اپنی قوت بازو دکھا چکے تھے۔ بہتے ہوئے دریا پر قبضہ کر لیا۔ واقعۂ کربلا سے پہلے بھی دنیا کے سامنے حسینؑ کے لئے کوئی کمی نہ تھی۔ معاویہ کو خط لکھا تھا کہ میرے لئے کسی شرف کی ضرورت کیا ہے۔ میرے لئے یہ کیا کم ہے کہ میں علیؑ کا بیٹا ہوں۔ حسینؑ کو آرام کی زندگی بسر کرنے کی خواہش بھی نہ تھی۔ حسینؑ نے بچپن سے تکلیف کی زندگی بسر کرنا سیکھا تھا۔ اس کا نانا وہ تھا کہ بھوک سے بیچین ہو کر گھر آتا تھا۔ اس کی ماں وہ تھی کہ چکی پیس پیس کر زندگی بسر کرتی تھی۔ وہ تین تین دن تک فاقہ کرتی تھی۔ حسینؑ نے اس ماحول میں تعلیم پائی تھی۔ گرم و سرد دیکھا تھا۔ حسینؑ نے حالات کو دیکھا تھا۔ حسینؑ ایسی زندگی بسر کرنے کے عادی نہیں تھے۔ جس کو حاصل کرنے میں ان کو دقتیں ہوتیں ان کی ایسی عظیم منزل ہے۔ حسینؑ کی نگاہ اس سے زیادہ تھی۔ حسینؑ کے پیشِ نظر یہ بات نہیں تھی۔ حسینؑ کے پیشِ نظر صرف ایک سوال تھا کہ رسول نے مجھ پر اعتماد کیا تھا کہ اگر اسلام پر خطرہ آئے گا تو میں بچاؤں گا۔ میں ہی بچاؤں گا (سبحان اللہ) اس کو حسینؑ نے گرہ میں باندھ لیا۔ بارہا آپ نے سنا ہوگا۔ آج بھی یہ جملہ استعمال کیا جاتا ہے کہ اسلام خطرہ میں ہے۔ اسلام کبھی اس سے زیادہ خطرے میں نہیں تھا جیسا کہ ۶۱ھ میں تھا۔ تاتاریوں نے بڑے مظالم مسلمانوں پر کئے۔ بغداد کا تختِ خلافت اُلٹ دیا گیا۔ عرب سے مسلمان نکال دیئے گئے۔ مسلمانوں کی تباہیاں ہوئیں اور دوسری جگہ پر تباہیاں ہوئیں لیکن یہ بعد کی باتیں ہیں جب اسلام سنبھل چکا تھا۔ اور جب اسلام کا دھارا جاری ہو گیا تھا۔ جب ایک طرف اسلام کو روکا جاتا تھا تو دوسری طرف بڑھ کر حسینؑ نے اسلام کو اس موقعہ پر بچایا جب اس کا دھارا بہت پتلا تھا اور جس پر یزید کا بند باندھ دینا دراصل اسلام کو ختم کرنا تھا۔ حسینؑ کے پیشِ نظر سوائے اس کے کچھ نہ تھا۔ ان کی یہ کوشش پچاس برس جاری رہی کہ جب اسلام پر سب سے زیادہ سخت وقت آئے تو وہ اس کو

بچالیں۔ صفین کے میدان میں علیؑ کے سر پر بوجھ تھا۔ حسینؑ نے کوئی رائے زنی نہیں کی، حضرتِ حسنؑ نے جب صلح کرنی چاہی۔ حسینؑ سب کچھ جانتے تھے مگر حسنؑ کا ہاتھ نہیں روکا کیونکہ جانتے تھے کہ ہمیں اور موقعہ ملنے والا ہے ہم کو کسی اور وقت جان اور سر کی بازی لگانا پڑے گی۔ اس وقت جو اسلام کو بچا سکتے ہیں بچالیں۔ جیسے ان کی سمجھ میں آئے وہ بچائیں جیسے ہماری سمجھ میں آئے گا ہم بچائیں گے۔ میں پھر عرض کرنا چاہتا ہوں کہ جناب علی مرتضیٰ نے بڑی فوجیں جمع کر کے اسلام کو بچانے کی کوشش کی۔ حضرتِ حسنؑ نے صلح کر کے اسلام کو بچانے کی کوشش کی۔ حسینؑ کے لئے نہ جنگ مناسب تھی نہ صلح مناسب تھی، انھوں نے دوسرا طریقہ اختیار کرنا چاہا۔ جو انھوں نے اختیار کیا۔ بڑی بڑی فوجوں کا مقابلہ چھوٹی چھوٹی فوجوں نے کیا ہے اس کے واقعات تاریخ میں ہیں۔ بہت اچھے اچھے مقابلے کئے گئے ہیں۔ بہت سے سورماؤں نے مقابلے کئے ہیں اپنی جانوں کی بازی لگادی ہے، اپنے سر ہتھیلی پر رکھ کر آگ میں کود پڑے ہیں۔ لوگوں نے خون بہلئے ہیں۔ تاریخ میں کوئی نیا واقعہ نہیں ہے۔ پھر کربلا میں کونسی بات ہے کہ آج بھی یہ واقعہ تازہ ہے کہ آج بھی ذرے اُٹھے جائیں تو خون کا قطرہ ٹپکے۔ ہم تمام واقعات کو محو کر جاتے ہیں۔ لیکن کربلا کے واقعات کو نہیں کرتے۔ حسینؑ اس کو ایسا عظیم بنانا چاہتے تھے کہ آنے والی صدیاں بھی نہ بھولیں۔ حسین علیہ السلام نے کونسا انتظام کیا علماء موجود ہیں۔ اسلامی تاریخ پر ان کی نظر ہے۔ آپ حضرات نے بھی پڑھا ہے۔ میں صرف اشارہ کروں گا۔ امیر معاویہ اور اس سے پہلے بنی امیہ اور بنی ہاشم کے جو اختلافات تھے ان کو عرض کرنا نہیں چاہتا۔ جب بنی امیہ کے لوگ تختِ سلطنت پر جلوہ افروز ہو گئے تو ان لوگوں نے بنی ہاشم کو اور ان کے دوستوں کو ختم کرنا چاہا اور اس سلسلے میں بنی امیہ کے لوگ یہ کرتے تھے کہ کبھی تلواروں کی جھنکار میں، کبھی خون کے فواروں میں اور کبھی زہر سے ان لوگوں کو ختم کرتے تھے جو بنی ہاشم کے ساتھ اس انقلابی طاقت کا ساتھ دیتے تھے جسے اسلام کہا جاتا تھا جو دنیا کی برائیوں کو خاک میں ملانے آیا تھا۔ رجعت پسند طاقتیں مختلف طریقہ کے حربے استعمال کرتی تھیں۔ سب سے عجیب یہ حربہ تھا کہ ایک آدمی کو تنہا شہید کیا جائے۔ کسی کو زہر

دیا جائے کہ دنیا میں اس کی یادگار قائم نہ ہو سکے۔ جناب علی مرتضیٰ تلوار سے مارے گئے تھوڑے دن لوگوں نے غم کیا، امام حسنؑ کو زہر دیا۔ کچھ دن لوگوں نے غم کیا پھر بھلا دیا۔ پہلے بھی ایسے واقعات پیش آچکے تھے۔ ابو ذر غفاریؓ ربذہ میں شہید کئے گئے۔ حقیقتاً ان واقعات سے کوئی مجموعی اثر پیدا کرنے کی ضرورت محسوس نہیں ہوئی کہ جناب امام حسینؑ اس اموی پول کو کھولنا چاہتے تھے۔ انھوں نے یہ طے فرمایا کہ چاہے ہماری تعداد کم ہو لیکن اس طرح سے خون بہا دیں کہ دنیا بھول نہ سکے۔ ایک ایک آدمی کو مار لینا مشکل نہ تھا۔ اسکی کوئی اہمیت نہیں رہ سکتی۔ ان کو لوگ بھول جائیں گے۔ جب بہتّر آدمی سخت گرمی میں بھوکے پیاسے شہید ہوتے ہیں۔ جن میں بوڑھے بھی بچے بھی موجود ہیں۔ جن کی مدد کرنے والی عورتیں بھی موجود ہیں۔ اس سے کربلا کے واقعہ میں عظمت پیدا ہوتی ہے، ورنہ حقیقتاً اتنا ہی اہم واقعہ حضرتِ علیؑ اور حضرت امام حسنؑ کی شہادت کا بھی ہے، لیکن کیا بات ہے کہ کربلا کے واقعہ سے ہماری ہمدردی عام طور سے منسلک ہو جاتی ہے۔ ہم بھولنے کی کوشش کے باوجود اس کو بھول نہیں سکتے۔ جو مٹانے کے درپے ہیں وہ بھی خلش محسوس کرتے ہیں۔ تاریخ اس چیز کی گواہی دے گی کہ اس واقعہ کو مٹانے کی کوشش کی گئی لیکن مٹا نہ سکے۔ حسینؑ اس طرح سے دنیا کے سامنے اس واقعہ کو لانا چاہتے تھے اور اس میں کامیاب ہو گئے۔ جن پر ان کو بھروسہ نہیں تھا، ان کو علیحدہ کیا گیا۔ ان لوگوں کو ڈھونڈ کر بلایا جن پر بھروسہ تھا۔ جب ہمارے ستر آدمی مر جائیں تو پھر ہم مریں۔ جب تک ساتھی زندہ رہے تو ہنستے رہے۔ جب مرنے لگے تو یہ کہہ کر مرے کہ حسینؑ سے غافل نہ رہنا۔ زمانہ کا غم نہیں۔ خورد قصور کی خواہش نہیں۔ صرف یہ غم تھا کہ دل میں کمزوری نہ ہو مرتے وقت ایک دوسرے کو مضبوط بناتے چلے جا رہے ہیں۔ اس طرح سے حسینؑ نے اس واقعہ کو مضبوط تر بنا دیا۔ وہ تکلیفوں کے مقابلہ میں خندہ جبینیاں دکھاتے تھے۔ وہ تیروں کے مقابلے میں اپنا سینہ رکھ دیتے تھے۔ تاکہ دنیا سمجھے کہ مقابلہ اس طریقہ سے بھی کیا جا سکتا ہے۔ یہ چیز واقعۂ کربلا کو بہت بلند کرتی ہے۔ بہت بڑھا دیتی ہے۔ ہم نظر ڈالتے ہیں تو کوئی اور واقعہ اتنا بڑا نظر نہیں آتا۔ جس کی عظمت کے آگے ہمارے سر جھک جائیں۔

حسینؑ ـــ ارتقائے انسانیت

ڈاکٹر ذاکر حسین

آج دنیا کے ہر گوشہ میں ایک خوفناک واقعے کی یاد لوگوں کو آرہی ہے جسے گذرے ہوئے ایکہزار تین سو برس سے اوپر ہو گئے (۱۳۰۰)۔ کیا یہ کسی خاص عصبیت کو قائم رکھنے کی خواہ مخواہ کوشش ہے ؟ انسانی تاریخ کا دامن کیا المناک حوادث سے اتنا خالی ہے اور رنج والم اور درد و کرب کیا انسانی زندگی میں ایسے نادر تجربے ہیں کہ بس بعض المناک حوادث کو چن چن کر یاد رکھا جائے ؛ میں سمجھتا ہوں کہ بات اس سے زیادہ گہری اور اس سے زیادہ اہم ہے۔ مجھے تو اس واقعہ میں ارتقاءِ انسانی کے اصل اصول کا راز چھپا نظر آتا ہے اسے یاد کرکے، اسے یاد رکھ کر انسانیت جو بھولتی بھی ہے، بھٹکتی بھی ہے۔ سیدھی شاہراہ کو چھوڑ کر ادھر ادھر پگڈنڈیوں پر پڑی پھرا بھی کرتی ہے، اور آگے بڑھنے کی جگہ پیچھے ہٹتی رہتی ہے۔ وہ انسانیت اس واقعہ کو یاد کرکے، سچ یہ ہے کہ اپنی صحیح راہ کو یاد کرتی ہے اور ایک دفعہ پھر منازل ارتقائی کو طے کرنے کا قصد کرتی ہے چاہے یاد دھندلی سی ہو چاہے یہ قصد بہت ہی کمزور سا ارادہ ہو۔

تاریخ کا ہر واقعہ کسی خاص سیاسی اور تمدنی ماحول میں پیدا ہوتا ہے اور بہت سے دوسرے واقعات سے مربوط ہوتا ہے۔ ربط کا یہ حلقۂ اثر بہت چھوٹا ہوتا ہے اور تاریخ انسانی کی وسعت میں یہ مربوط وحدت زیادہ مؤثر وحدت کی حیثیت نہیں رکھ سکتی اور تاریخ اسے ہوتے ہوئے بھلا دیتی ہے لیکن بعض واقعات باوجود اپنی تاریخی مکانی اور زمانی پابندیوں کے حیاتِ انسانی کے کسی ایسے اہم اصول کے ترجمان ہوتے ہیں کہ جب تک وہ اصول کارفرما ہیں ان کا بھلانا ذہنِ انسانی کے لئے دشوار ہوتا ہے۔

وہ ایک منفرد واقعہ نہیں ہوتا بلکہ سارے واقعات کی روح ہوتا ہے۔ ان واقعات کا فہم حوادثِ تاریخی کے بے ربط وبے ترتیب انبار میں ربط و ترتیب پیدا کر دیتا ہے۔ ان سے تاریخ کی تاریکیوں کو روشنی نصیب ہوتی ہے اور اس کا بظاہر بے معنیٰ سا سلسلۂ واقعات بامعنی معلوم ہونے لگتا ہے شہادتِ حسینؓ کا واقعہ اسی قسم کے واقعات میں سے ہے، یہ ایک مخصوص تاریخی چوکھٹے میں دراصل زندگی کے عالمگیر اصل اصول کو انسانیت کے سامنے پیش کر دیتا ہے۔

قدرت نے انسان کے علاوہ ہر بے جان اور جاندار مخلوق کو اپنے وجود کا توازن رکھنے کے لئے اندرونی کشاکش سے بچایا ہے۔ کہیں مادی خواص کو، کہیں فطری جبلتوں کو اس توازن کا ضامن بنا دیا ہے۔ داخلی تضاد کی کٹھن منزل جو انسان کے لئے انفرادی اور اجتماعی دونوں حیثیتوں میں مقدر ہے۔ اس سے اور ساری مخلوق محفوظ ہے۔ پتھر بھی اس سے مامون ہیں، جانور بھی۔ فرشتے بھی، ایک انسان ہی ہے جس کے نصیب میں متضاد عناصر کی کشمکش سے ہم آہنگی پیدا کرنا ہے۔ یہ اپنا توازن کھو بھی سکتا ہے، پا بھی سکتا ہے یہ ایسا لگتا ہے کہ انسان شاید ایک درمیانی عبوری مخلوق ہے۔ اس کے وجود کی سرحدیں ایک طرف حیوانی علاقہ سے ملتی ہیں، ایک طرف الٰہی سے۔ اس کے سینے کو متضاد قوتوں اور میلانوں کا جولانگاہ۔ کفر وشکر کی کشاکش میں اسے ڈال کر روحِ انسانی کو یہ سعادت ارزانی کی گئی ہے کہ وہ اسی مشکل میں ایک ہم آہنگ ومتوازن حیاتِ طیبہ کی تعمیر کر سکتی ہے۔ مادی اشیاء کی دلفریب کشش سے بھی اسے واسطہ ہے اور مادیت سے دامن چھڑانے کا شدید ولولہ بھی اس میں کارفرما ہے، یہ خودغرضی وخودبینی کا مرکز بھی ہے اور محبت کی بے غرضی اور بے نفسی سے بھی اس کا سینہ معمور ہے یہ سفاکانہ تاخت وتاراج کے بے خیال اور برخود غلط جنون کا شکار بھی ہو سکتا ہے اور بے تھکن کٹھن سے کٹھن جماعتی تعمیر کے لئے اپنی قوت کا ایک ایک شمہ وقف بھی کر سکتا ہے۔ یہ تمرد اور نخوت و غرور کے نشے میں معصوم گردنوں سے خون کے دریا بہانے سے نہیں جھجکتا اور تسلیم و رضا کا کشتہ بننا بھی اسی کو آتا ہے۔ یہی حریصوں کی طرح ٹوٹتا ہے، یہی بہار کی طرح لٹاتا ہے۔

یہی اوروں سے چھینتا ہے۔ یہی اپنا سب کچھ اوروں پر نثار کر دیتا ہے۔ یہی پلی پلی جوڑتا ہے، یہی کپتے ڈھلکاتا ہے۔ یہی تغیر سے ڈرتا ہے اور سارے تغیر اس کے شرمندۂ احسان ہیں۔ یہی احتیاط کے مارے...... پھونک پھونک کر قدم اٹھانے سے بھی ڈرتا ہے اور پھر یہی سرفروشانہ دہکتی آگ میں کود پڑتا ہے۔ یہ زمین سے نگہ نہیں ہٹا سکتا یہی ستاروں سے باتیں کرتا ہے یہی غفلت میں اعلیٰ سے منہ موڑ کر ادنیٰ کا گرویدہ ہوجاتا ہے۔ یہی ہوشیار ہو کر ادنیٰ کی آلودگیوں سے دامن چھڑا کر اعلیٰ کی طرف بے تابانہ بڑھتا ہے۔ یہی زندگی پر جان دیتا ہے اور حیاتِ بے شرف پر راضی ہوجاتا ہے۔ یہی جان دے کر زندگی کا چراغ روشن کرنا بھی جانتا ہے اور مرگِ باشرف کو اصل حیات اور ضامن حیات مانتا ہے، یہی سرِتسلیم خم کرتا ہے، یہی کافر ہے، یہی مومن، یہی فرعون، یہی موسیٰ یہی شرارِ بولہبی، یہی چراغِ مصطفوی یہی یزید، یہی شبیرؑ اس کے ارتقاء کا سارا راز اور اس کی انسانیت کا سارا شرف، اس میں ہے کہ یہ ادنیٰ پر اعلیٰ کو ترجیح دینے کے لئے اپنے ضمیر کی پکار، اپنے قلب کے حقیقی میلان، اپنی عقلِ سلیم کے سچے رجحان کی وجہ سے مجبور ہے۔ یہ اس پکار کو ٹال لیتا ہے۔ اس میلان کو دباتا ہے۔ اس رجحان کو توڑتا مروڑتا ہے لیکن اس سے خالی نہیں ہوسکتا۔ یہ برائیاں کرتا ہے مگر اچھائی سے ہمیشہ کے لئے رُوگردانی نہیں کرسکتا۔ ظلم کرتا ہے مگر عدل کے مطالبے اسے بے چین رکھتے ہیں، باطل کی حمایت کرتا ہے مگر حق سے دامن نہیں چھڑا سکتا۔ بدنمائیوں پر قانع نظر آتا ہے مگر حسن کے جادو سے پوری طرح محفوظ کبھی نہیں رہ سکتا۔ اسفل کی گھاٹیوں میں رہتے ہوئے بھی ایک گوشۂ چشم سے اعلیٰ کی چوٹیوں کو تکتا رہتا ہے۔ جب برائیوں کا غلبہ ہوتا ہے جماعتی زندگی مفاسد سے پُر ہوتی ہے اور ضمیر کی انفرادی زندگی اس مسموم ہوا میں دم توڑتی ہے تو ا؎ تت اس کا کوئی نہ کوئی فرد اس کے حقیقی ضمیر کا ترجمان اس کی اعلیٰ قدروں کا محافظ اور معلّم بن کر اسے جھنجھوڑتا اور بیدار کرتا ہے اور اپنے کو خطرے میں ڈال کر اسے اپنی حقیقی تقدیر کے فراموش کرنے یعنی روحانی خودکشی سے باز رکھتا ہے۔ کربلا میں شہادتِ حسینؑ کا واقعہ ارتقاءِ انسانی کے اس عمل کا ایک مہتم بالشان غیر فانی تاریخی مظاہرہ تھا۔ یہ باطل کے مقابلے میں حق کا، جماعتی مفاسد کے مقابلہ میں، افرادِ صالحہ کا،

حکومت کے ظلم کے مقابلہ میں شہری مطالبۂ عدل کا اور بے دینی کے مقابلہ میں دین کا مظاہرہ تھا کہ کہیں سیاسی اقتدار و جبروت ضمیرِ انسانی کی چنگاری کو بالکل بجھا نہ دے اور کہیں مصلحت اندیشی خوف، تن آسانی انسان کو اقتدارِ مطلقہ کے مطالبوں سے بیگانہ نہ کر دیں۔

یہی قوتِ ارتقائی جس کے حامل حسینؑ تھے انسان کی حیاتِ طیبہ کی ضامن ہے۔ یہی اس کو بہیمیت کے اسفل السافلین میں لوٹ جانے سے روکتی ہے اور اس کا طریق کار بھی یہی ہے کہ اس کے حامل، اس کے تقاضوں کو اپنی زندگی میں پورا کریں، کہ اس کے تقاضے، اس کے مطالبے، دلیلوں سے منوائے نہیں جا سکتے۔ نہ خالص عقلی مقولوں سے ثابت کئے جا سکتے ہیں بلکہ ان کو اپنی زندگی میں برت کر دکھانا ہوتا ہے۔ ان کے لئے آرام و آسائش کو تجنا اور اپنے پرائے سے بُرا بننا پڑتا ہے۔ محبت کے پھول برسا کر پتھر کھانے ہوتے ہیں۔ دعاؤں کے جواب میں گالیاں سننی پڑتی ہیں۔ مخلصانہ خدمتوں کے عوض بدگمانیاں اور بے اعتمادیاں ملتی ہیں۔ ان سب کو مسکرا کر سہنا ہوتا ہے اور ان کی خاطر جئے جانا ہوتا ہے۔ مگر سب سے زیادہ وضاحت سے اور اپنی غیر مشروط مطلق شکل میں یہ اس وقت سامنے آتے ہیں۔ جب ان کے لئے ناکامیوں کو کامیابیوں پر اور محرومیوں کو کامرانیوں پر ترجیح دی جاتی ہے اور اپنی پوری شان اور رنگینی میں اس وقت، جب ان کے لئے جان کی بازی لگانی ہوتی ہے۔ کربلا کے میدان میں اقدارِ مطلقہ کی یہ حمایت اپنی اسی صاف اور واضح اور بے میل شکل میں دنیا کے سامنے آئی اور ایک داستانِ سادہ و رنگین سے تاریخ انسانی کو ہمیشہ کے لئے مالا مال کر گئی۔

کس سادگی سے فرمایا اس شہیدِ انسانیت نے حق پر اپنی آخری شہادت سے ایک شب پہلے "لوگو! دنیا نے اپنا رنگ کیسا بدل لیا ہے، دنیا نیکی سے خالی ہو گئی ہے۔ افسوس دیکھتے نہیں کہ حق کو پس پشت ڈال دیا گیا ہے اور باطل پر اعلانیہ عمل کیا جا رہا ہے اور کوئی نہیں جو اس کا ہاتھ پکڑے اسے سہارا دے۔ بس اب وقت آ گیا ہے کہ مومن حق کی راہ میں

بقائے الٰہی کی خواہش کرے۔ میں شہادت کی موت چاہتا ہوں۔ ظالموں کے ساتھ زندہ رہنا بھی بجائے خود ایک جرم ہے۔" یہ شہیدِ حق تخت و تاج لینے نہیں نکلا تھا۔ تاج و تخت لینے والے لقائے الٰہی کی خواہش نہیں کیا کرتے۔ تاج و تخت چاہنے والے یکسوئی سے شہادت کا قصد کرکے نہیں نکلا کرتے، تاج و تخت کے طالب مٹھی بھر آدمیوں سے لشکرِ جرار کا مقابلہ نہیں کرتے۔ یہ شہیدِ حق اس سستی "کامیابی" کے لئے نہ نکلا تھا جو انسان کو اکثر سچائی اور اچھائی سے بے تعلق و بیگانہ کر دیتی ہے۔ "کامیابی" چاہنے والے اپنے گنے چنے ساتھیوں کو معرکے سے پہلے، ساتھ چھوڑ سکنے کی رخصت نہیں دیا کرتے، وہ مقابلے سے پہلے کی شب میں، ان سے یہ نہیں کہہ سکتے کہ "کل میرا اور ان کا فیصلہ ہو جائے گا۔ میری رائے ہے کہ تم خاموشی سے نکل جاؤ۔ میں خوشی سے تمھیں رخصت کرتا ہوں" ایسا معلوم ہوتا ہے کہ کسی کو سمجھنے میں دشواری نہ ہو۔ پھر جب وفادار ساتھی ساتھ نہیں چھوڑتے تو قربانگاہِ تسلیم و رضا پر اپنی آنکھوں کے سامنے قربانی پیش فرماتے ہیں اور ایک ایک کرکے وفادار ساتھی قربان کئے جاتے ہیں۔ عورتوں اور بچوں کو بے وارث ہوتے دیکھا جاتا ہے، جوان بیٹے کو اپنے آگے راہیِ ملکِ بقا کیا جاتا ہے۔ پیاس سے بلکتے ہوئے شیر خوار بچے کو اپنے ہاتھوں میں دم توڑتے ہوئے دیکھا جاتا ہے اور پھر اپنی جان کا ہدیہ جانِ آفریں کی بارگاہ میں پیش کر دیا جاتا ہے۔ گویا حق کے لئے قربانی کی ہر دشوار سے دشوار اور دل شگاف سے دل شگاف شکل کی مثال بیک وقت پیش کر دینا چاہتے تھے کہ کوئی یہ نہ سمجھے کہ اس راہ میں کوئی ایسی قربانی بھی ہے جو نہ کی جائے۔ قدرت کو بھی شاید اس سبق کی وضاحت منظور ہے ادھر سے قوت و جبروت بھی اپنی سب عادتوں کا پورا مظاہرہ کرتے ہیں ان بظاہر ناکام مخالفوں کے سر کاٹے جاتے ہیں۔ انکی لاشیں روندی جاتی ہیں ان کی عورتوں کے سروں سے چادریں اتاری جاتی ہیں، ان کے خیمے جلائے جاتے ہیں رسیوں سے باندھا جاتا ہے، طوق پہنائے جاتے ہیں۔ ناکامی کی ہر ممکن شکل کا ظہور ہوتا ہے تاکہ حق پرستی کا سب سے مؤثر سبق انسانیت کے ذہن نشین ہو جائے۔ حق کی راہ میں ناکامیوں کو سینہ سے لگانا اور اسکی آخری فتح پر ایمان رکھنا حق کی حقیقی قوت کو آشکار کرنا ہے، یہی انسانیت کی ضمانت ہے، یہی شہادتِ حسین کا ماحصل۔ اسی سے حسینؑ انسانیت کے محسنینِ اعظم میں ہیں اور ان کی شہادت کی داستان تاریخِ انسانیت کا ایک نہایت قیمتی اور رنگین ورق ہے۔

اُردو مرثیہ پر ایک نظر

سیّد قدرت نقوی

مرثیہ اردو ادب میں وہ صنفِ سخن ہے جس میں امام حسین علیہ السلام اور ان کے رفقا کے واقعاتِ شہادت نظم کیے جائیں۔

اُردو مرثیہ کی ابتدا کے متعلق اختلاف ہے۔ بعض کا قول ہے کہ یہ عربی شاعری سے فارسی کے ذریعے مستعار ہے۔ بعض اس کو برِّصغیر پاک و ہند ہی سے مخصوص قرار دیتے ہیں، دونوں گروہ اپنے اپنے دلائل رکھتے ہیں لیکن اردو مرثیہ کے عروج وارتقا پر جب نظر ڈالی جاتی ہے تو ہم بآسانی اس نتیجہ پر پہنچ جاتے ہیں کہ اس صنفِ سخن کا ظہور سرزمینِ پاک و ہند ہی میں ہوا۔ کیونکہ مرثیہ لغوی معنی کی حیثیت میں تمام روئے زمین پر پایا جاتا ہے یعنی وہ نظم جس میں کسی مرنے والے کے اوصاف بیان کر کے اظہارِ تاسف کیا گیا ہو۔ یہ مرثیہ دنیا کی ہر قوم میں ملتا ہے اور تقاضائے فطرتِ انسانی کے عین مطابق ہے چنانچہ عربوں میں بھی یہ اسی حیثیت میں اسلام سے پہلے اور اسلام کے بعد بھی ملتا ہے۔ خود حضرت امام حسین علیہ السلام کی شہادت پر مرثیے موجود ہیں۔ فارسی میں بھی انفرادی مراثی کی کمی نہیں لیکن طہماسپ صفوی کے زمانے سے مرثیۂ حضرت امام حسینؑ کو ترقی حاصل ہوئی ہے محتشم کاشی کے ہفت بند اور مقبل کی مثنوی کو قبولیتِ عام و شہرتِ دوام کا درجہ حاصل ہوا۔ فارسی زبان کے ساتھ یہ دونوں مرثیے بھی ہندوستان میں مروج ہوئے۔ اور مجالس میں عام طور پر ان کا رواج ہوا۔ لیکن دکن میں جو مرثیے ملتے ہیں وہ اپنی ہیئت اور اظہار و تاثیرِ بیان کے لحاظ سے الگ نوعیت کے حامل ہیں۔ علاوہ ازیں لفظ مرثیہ ایرانی ادب میں بطور اصطلاحِ شعری تھا۔ واقعاتِ کربلا کے بیان سے مخصوص نہ تھا۔ دکن میں مرثیہ

واقعاتِ کربلا سے مخصوص پایا جاتا ہے اور اس وقت تک دکن میں جو مرثیے پائے جاتے ہیں ان میں اوّلیت کا شرف محمد قلی قطب شاہ کو حاصل ہے جس کے کلیات میں مرثیہ کے تحت وہ نظمیں ہیں جن میں واقعات کربلا بیان کئے گئے ہیں ۔ نوحہ و مرثیہ دونوں پائے جاتے ہیں ۔ اردو میں مرثیہ کی تین قسمیں ہیں۔ نوحہ ، سلام ، مرثیہ۔ نوحہ وہ صنفِ سخن ہے جس میں غزل کے طور پر صرف مبکی یعنی بینیہ مضامین نظم کئے جائیں ۔ سلام وہ صنف سخن ہے جس میں غزل کے طور پر مدحیہ اور بینیہ مضامین ملے جلے نظم کئے جائیں ۔ مرثیہ عام ہے ان کے علاوہ مثنوی کی طرز میں مسلسل واقعات لکھنے کا رواج بھی تھا ۔ لیکن ایسی مثنویوں کو مرثیہ نہیں کہا جاتا تھا۔ بلکہ شہادت نامہ کے نام سے یاد کیا جاتا تھا ۔

شاعری میں اظہار کی دو صورتیں ہیں ۔ ایک انفرادی اور دوسری اجتماعی۔ مرثیہ پاک و ہند میں اجتماعی اظہار کی شکل میں نمودار ہوا یعنی ایک ہی درد کو ایک گروہ نے محسوس کیا اور اس کے اظہار کی کوشش کی۔ پاک و ہند میں یہ اظہار ملکی و غیر ملکی زبانوں میں ہوتا رہا۔ اہلِ دکن خوش قسمت ہیں کہ انھوں نے اپنے آثار کو محفوظ کر لیا۔ شمالی ہند والوں نے ان آثار کو محفوظ نہ رکھا بلکہ وہ سینہ بسینہ منتقل ہوتے رہے ۔ اور صفحۂ ہستی سے محو ہوتے رہے ۔ یہی حال پنجاب ، سندھ اور سرحد والوں کا ہے ۔ پنجابی ، پشتو اور سندھی میں مرثیے کہے گئے ۔ پڑھے گئے ۔ سینہ بسینہ منتقل ہوتے رہے اور ضائع ہوتے رہے ۔ یا بعض مرثیہ خوانوں کی بیاضوں میں محفوظ تو رہے لیکن عام نہ ہو سکے اس علاقے میں صرف ملتانی ایسی زبان ہے جس میں کثیر تعداد میں مرثیے کہے گئے اور ان میں سے بہت کچھ محفوظ بھی ہیں ۔ غرض دکن کے بعد شمالی ہند میں مرثیہ کہنے کا رواج بہت تھا لیکن وہ آثار آج ناپید ہیں ۔ کہیں کہیں کسی مرثیہ گو کا ذکر مل جاتا ہے اور بس۔ یہ تمام مرثیے یا تو زبانی یاد رہتے تھے یا مرثیہ خوانوں کی بیاضوں میں محفوظ ہو جاتے تھے ۔ مگر مرثیہ خوانوں کی بیاضیں رنگِ مجلس کے مطابق بدلتی رہتی تھیں ۔ اس لئے وہ مرثیے بھی ضائع ہو جاتے تھے اس کا ثبوت آج بھی ان مراثی سے ملتا ہے جو شمالی ہند کی مختلف ذیلی بولیوں میں ملتے ہیں ۔ اگر لوک کہانیوں کی طرح انھیں بھی تلاش و جستجو کے بعد جمع کیا جائے تو مرثیے کے ارتقاء کی بہت سی

صورتیں واضح ہو سکتی ہیں۔ مثلاً ایک سوز کے دو مصرعے ہیں ؎

دیس عرب کا بیوپاری بھراپڑا انجارا رے　　شام نگر کے راہزنوں نے گھیر کے اس کو مارا رے

فضلی کی وہ مجلس یا کربلا کتھا اگرچہ نثر میں ہے لیکن خود فضلی اور ان کے بھائی کرم علی اچھے مرثیہ گو تھے۔ فضلی سے پہلے ولی دیلوری "وہ مجلس" کو منظوم کر چکے تھے یہ مثنوی کے طور پر لکھی تھی۔ سن تصنیف ۱۱۴۱ھ ہے۔ فضلی نے نثر میں ۱۱۴۵ھ میں روضتہ الشہدا کا ترجمہ کیا ہے۔ غالباً ولی دیلوری کے پیشِ نظر بھی روضتہ الشہدا ہی کا نسخہ رہا ہوگا۔ فضلی دہلی کے باشندے تھے خود بھی شاعر تھے اور ان کے بھائی کرم علی مرثیہ گو اچھے شاعر تھے۔ شمالی ہند کے اس دور کو شاعری کا ابتدائی زمانہ بتایا جاتا ہے۔ لیکن مجھے اس کے تسلیم کرنے میں تامل ہے کیونکہ شاعری کی ایسی منجھی منجھائی زبان ایک دم وجود میں نہیں آسکتی ہے۔ شاعری اور زبان دونوں کی پرورش دیر سے ہو رہی تھی لیکن ان کو قابلِ اعتنا نہیں گردانا جاتا تھا۔ وجہ یہی ہے کہ مرثیے صرف ثواب کی خاطر کہتے تھے اور اس میں زیادہ تر بینیہ مضامین ہوتے تھے۔ یا کچھ شعر مدح و منقبت کے، اس دور میں زیادہ اہمیت سلام اور نوحہ کو حاصل تھی۔ مرثیہ جس میں مسلسل مضمون ہو چومصرعی تھا۔ مثلاً ایک مرثیے کے مطلع کا بند ہے ؎

حسینؑ ابنِ علیؑ رہنمائے راہِ نجات　　سرورِ جانِ پیمبر شہِ ستودہ صفات

سو اس کو ظلم ستی مل کے شامیِ بدذات　　کئے شہید ہزاروں جفا ستی ہیہات

یہاں کرم علی کا ایک بے نقط سلام کا نمونہ ملاحظہ فرمائیے :۔

مورد احکامِ اسرار السلام ⁂ مصدرِ اولادِ اطہار السلام

عالمِ علم و عمل، عادل امام ⁂ سرور و سردار و سالار السلام

رہبرِ راہِ ہدا معصوم او ⁂ دادرِ اروحِ احرار السلام

دل کا والا درد کا ماہر کمال ⁂ مالکِ املاک ادوار السلام

دکن اور شمالی ہند وغیرہ کے مرثیہ گو شعرا میں ایک اور فرق بھی ہے۔ دکن کے شعراء دیگر اصنافِ سخن کے ساتھ ساتھ مرثیہ کہتے تھے۔ انہی اصنافِ سخن کی بدولت انھوں نے اپنے دواوین و کلیات مرتب کئے اور مرثیے کو بھی دیوان و کلیات میں شامل کر لیا۔ اس طرح وہ

باقی رہ گئے۔ شمالی ہند وغیرہ میں مرثیہ گوئی حصول ثواب کی خاطر نبھائی جاتی تھی اور جو اس طرف کلیتہً رجوع کرتا تھا۔ وہ دیگر اصناف کو بنظر حقارت دیکھا کرتا اسی بنا پر ان کو کسی تذکرہ میں جگہ نہ مل سکی۔ مثال کے طور پر کرم علی کا ذکر کسی تذکرہ نگار نے نہیں کیا حالانکہ وہ سوداؔ کے بعد تک زندہ رہے اور ان کا کلام ایک قادر الکلام شاعر کا کام ہے۔ مثلاً مرثیہ کا یہ بند دیکھئے ؎

یہ کہہ کے رن میں گیا سبطِ احمدِ مختار
تھم گئے ان کو مخاطب کیا وہ یکہ سوار
کہ اے گروہ ستم! میں جواب ہوں بیکس بے یار
جو رحم جھ پر کرو اب تو پاؤ روزِ نجات

افلاک نے کیا ہے لباس اپنا سب کبود
سوزش زمیں کی کر گئی افلاک پر صعود
خورشید و ماہ نور سے ہوئے ہیں بے نمود
اشک الم ہے سب کا رواں وامصیبتا
ارواح انبیاء سبھی غم سے زار ہیں
کروبیانِ عرش بریں بے قرار ہیں
حوراں بہشت بیچ سبھی اشکبار ہیں
سن کربلا کے بن کا بیاں وامصیبتا

الحاصل یہ صنفِ سخن ایک خاموش اور پُر وقار انداز سے ترقی کرتی رہی۔ اس دور کا ہر قادر الکلام شاعر اس صنفِ سخن میں طبع آزمائی کرتا تھا۔ دلّی اجڑی لکھنؤ بسا۔ اہلِ ہنر نے اِدھر کا رُخ کیا۔ نوابین و امراء کا مذہب شیعہ تھا۔ امام حسین علیہ السلام سے عقیدت کا تقاضا یہی تھا کہ مجالس بپا ہوتیں۔ جن میں مرثیے پڑھے جاتے۔ اب مرثیہ کہنے والے شعرا کی قدر دانی ہونے لگی۔ لکھنؤ کی ادبی فضا نے اس صنف سخن پر بھی اثر ڈالا۔ اگرچہ دہلی میں بھی شاہزادے اور امراء کے ہاں مجلسیں بپا ہونے اور مرثیے کہنے والوں کی سرپرستی کا کہیں کہیں ذکر ملتا ہے۔ چنانچہ کرم علی نے تین مرثیے حسب فرمائش شاہزادی صاحبہ عالم قطبی بیگم بنتِ کام بخش لکھے ہیں (تحریر ۱۲۳۱) لیکن جو سرپرستی نوابین و شاہانِ اودھ نے کی وہ اور کہیں نہیں ہوئی اور یہی ایک خاص سبب مرثیے کی ترقی کا ہوا۔ ورنہ مرثیہ گو ہر جگہ تھے مگر انھیں اتنا مرتبہ نہ مل سکا۔ علاوہ ازیں مرثیہ کہنے والے صرف شیعہ ہی نہیں تھے بلکہ شمالی ہند و دیگر مقامات پر سنّی حضرات نے بھی عقیدتاً بہت سے مرثیے لکھے ہیں اور بقول جوشؔ ملیح آبادی: "ہر قوم پکارے گی ہمارے ہیں حسین" بہت سے ہندو شعراء نے بھی مرثیہ سلام اور نوحے لکھ کر اپنی عقیدت کا اظہار کیا ہے۔ مگر یہ سب گمنامی

کے گوشے میں چھپے ہیں۔ کیونکہ ان کی سرپرستی نہیں کی گئی۔ ہندو شعرا اب تک مدحِ اہلبیت کرتے اور مرثیے لکھتے ہیں۔ روپ کماری ایک شاعرہ کے چند شعر ملاحظہ فرمائیے ؂

ڈوبی ہوئی دکھ کے ساگر میں سورج کی سنہری تھالی تھی　　عاشور کی صبح سے سانجھ تلک شبیر سے دنیا خالی تھی

دو کھیت پرے جل بہتا تھا اور پھول ادھر کملاتے تھے　　بے نیر ہی سوکھے جاتے تھے اور چاروں طرف ہریالی تھی

سرور پہ حسن کی دو صولتے دو چاند سے ٹکڑے وار دیئے　　بچے تو جیالے تھے ہی مگر ماتا بھی بڑی دل والی تھی

جب لٹ کے چلے کربل سے حرم اور آئیں سکھیاں ملنے کو　　جس مانگ کو دیکھا اجڑی تھی جس گود کو دیکھا خالی تھی

حقیقت امر یہ ہے کہ مرثیہ جس تحقیق و تنقید کا مستحق ہے۔ اس کی طرف پوری توجہ نہیں کی گئی، یہ اردو ادب کا قیمتی سرمایہ ہے کہ اس پر صحیح طور سے کام کیا جائے تو دنیا کے ادب میں اس کا جواب مشکل سے ملے گا۔ اس بے اعتنائی کے کچھ خارجی و داخلی اسباب بھی ہیں۔ ایک تو یہ کہ اس کو خالص مذہبی چیز سمجھ کر قابلِ توجہ نہیں سمجھا گیا۔ یہی وجہ ہے کہ خالص مرثیہ گو شعرا کا تذکرہ بہت کم ملتا ہے۔ دوسرے یہ کہ اس پر تنقید کرنے سے مذہبی مناقشات پیدا ہونے کا خدشہ ہوتا تھا۔ تیسرے یہ کہ مذہبی معتقدات بھی مانع ہوتے تھے۔ چوتھے یہ کہ بعض کوتاہ اندیش لوگوں نے مرثیہ کی فنی حیثیت ختم کرنے یا کم کرنے کو ایک ضرب المثل کا غلط اطلاق کر رکھا تھا یعنی بگڑا شاعر مرثیہ گو۔ بگڑا گویا نوحہ خواں یا مرثیہ خواں۔ اس غلط انتساب نے عام ذی فہم حضرات کی توجہ مرثیہ کی طرف سے ہٹا دی۔ حقیقت یہ ہے کہ اس ضرب المثل میں مرثیہ گو اور مرثیہ خواں سے وہ شعراء مراد نہیں ہیں جو امام حسین علیہ السلام کے مرثیے لکھتے اور پڑھتے ہیں۔

دراصل اس ضرب المثل میں بگڑا کا مطلب ناراض، خفا، برافروختہ ہے اور فارسی کی ایک حکایت ہے جو بطور لطیفہ بیان کی گئی ہے کہ ایک شاعر نے کسی بخیل امیر کی شان میں ایک قصیدہ لکھا اور جا کر اسے سنایا اس نے پسند کیا اور تعریف کی۔ صلہ کو ٹال دیا۔ شاعر نے تقاضا کا قطعہ لکھا وہ بخیل امیر اسے بھی پی گیا۔ تیسری مرتبہ شاعر نے اس کی ہجو لکھی مگر امیر صلے کے سلسلے میں ٹس سے مس نہ ہوا۔ اب شاعر نے جب اپنی تمام کوششیں بے سود دیکھیں، تو بخیل امیر کے دروازے پر دھرنا مار کے بیٹھ گیا۔ امیر باہر نکلا تو شاعر کو بیٹھا پایا، تو کہا کہ تو نے قصیدہ لکھا پھل نہ پایا۔ تقاضا کیا بے سود رہا، ہجو لکھی، کچھ نہ ملا۔ تجھ سے بڑا بے حیا شاید ہی کوئی ہو۔ اب کیوں بیٹھا ہے۔ تجھے کیا ملے گا۔ شاعر نے کہا کہ میں اس انتظار میں یہاں بیٹھا ہوں کہ تو مرے تو تیرا مرثیہ اور لکھ دوں۔ یہ سن کر اس

بخیل کو ہنسی آگئی اور شاعر کو کچھ دے کر ٹال دیا۔ ایسا ہی واقعہ ایک گویّے کا بیان کیا جاتا ہے۔
غرض بگڑا شاعر سے ناراض مراد ہے۔ نہ وہ شاعر جو فن شعر میں ناقص ہو یا جو شعر کے حسن و قبح سے ناآشنا ہو اور جس کا کلام اغلاط سے پُر ہو۔ بگڑنا کے دو معنی مشہور ہیں۔ خراب ہونا سڑنا۔ سڑنا نہایت کبیدہ خاطر ہونے کے معنی میں استعمال ہوتا ہے جس کے معنی بعض کے بھی ہیں دوسرے معنی ناراض ہونا مثلاً غالب؎

یوسف اس کو کہو اور کچھ نہ کہے خیر ہوئی گر بگڑ بیٹھے تو میں لائقِ تعزیر بھی تھا

غرض اس ضرب المثل میں بگڑا بمعنی ناراض ہے فن سے نابلد اور غلطی کرنے والا نہیں اس کا ثبوت اس امر سے بھی ملتا ہے کہ دکنی دور سے لے کر موجودہ دور تک جتنے مرثیہ گو شعراء کا کلام ملا ہے وہ اپنے دور کی فنی خصوصیات کا حامل ہے۔ اس کی ترقی کی منازل بھی دوسری اصناف سخن کے مانند ہیں۔ یہاں کچھ مثالوں سے اس امر کی وضاحت ہو سکتی ہے۔ دکنی دور میں قلی قطب شاہ سے لے کر ولی دکنی تک اس صنفِ سخن کا سراغ ملتا ہے بلکہ اس کے بعد نواب عثمان علی خاں تک مرثیہ ملتا ہے۔ قدیم دور کا کلام ملاحظہ فرمایئے۔

یک پوت کو دیتے زہر یک پوت پہ کھینچے خنجر کافر کئے کیسے یو زخم کاری ہائے ہائے
(محمد قلی قطب شاہ)

ستم سوں تیرہ انسانی کے اُدنا بکاری بھی (ظل اللہ)

حسین کا غم کرو عزیزاں انجو نین سوں جھڑو عزیزاں (وجہی)

نبیاں ولیاں کے انجواں سو مکھڑے یو غم حسین کا جنم دھو لایا

سلطانِ کربلا کی غریبی کوں یاد کر ٹکڑے جگر کوں ہور دلا کو خنجر کرو

دولت او پر ابد کی نظر ہے تو دل کو آج گنجینۂ صحبت اثنا عشر کرو (لطیف)

غواصیا معطر عالم کو سب کیا ہے گویا یو مرثیہ ہے ریحان کربلا کا (غواصی)

کاظم بڑا مشہور مرثیہ گو ہے۔ اس نے صرف مرثیے لکھے ہیں۔ خاص کر چو مصرعی زبان بہت صاف ہے۔

گلزارِ احمدی پہ چلی صرصرِ خزاں کانٹوں پہ سوگوار ہو بیٹھے ہیں بلبلاں

ہر سرو راستی پہ کریں نوحہ قمریاں بیدل صنوبراں کی خبر لو علی ولی

جب تے دھریا امام چرن کربلا منے — تب تے ہوا ہے غم کو رہن کربلا منے (شاہی)

عزیزاں دل ہوا پُر خوں یو سن اصغر کے نام کوں — گئے معصوم شہادت سوں کر و زاری مسلماناں

مبارک بدن سوں ہوا سر جُدا — اسی غم سوں کہتا ہے مرزا سدا

کیا کیا وہ بدبخت نے اے خدا — شہنشہ پیاسی پڑا تیاستم (مرزا)

سلطان دو جہاں کا سردار دیار کا — مظلوم کربلا کا تابوت لے چلے ہیں (ہاشمی)

اے نور چشم مصطفےٰ، فرزند، نوشاہ مرتضیٰ — اے دلبر خیر النسا توکیوں جا بسا یا کربلا

تو دوستاں کا جان ہے تیرا ذکر ایمان ہے — تجھ پہ ولی قربان ہے توکیوں جا بسایا کربلا (ولی)

وشمع بزم مصطفےٰ با داجل سوں گُل ہوا — سب سوزِ دل سوں تن سدا یاراں گلانے کیوں نہیں

چھوڑو سگل دنیا کے کام دس دن تلک اے خاص و عام — ماتم کے آتش میں مدام تن کو جلانے کیوں نہیں (ذوقی)

بانو کہیں اصغر نہیں اب میں جھولاؤں کس کے تئیں

سُونا ہوا ہے پالنا اب میں سولاؤں کس کے تئیں

اگن سوں ماتم شاہ کے جلا ہے تن بدن میرا

برنگِ برقِ خرمن، سوزِ دل ہے ہر سخن میرا (اشرف)

یتیم احمد ایک مرثیہ گو شاعر گزرا ہے۔ اس نے مسدس میں مرثیے لکھے ہیں۔ دورِ آصفی سے متعلق بتایا گیا ہے۔

حیف گھائل حُسینؑ تن تیرا — جسم پر خوں ہے پیرہن تیرا

تو کہاں ہور کیدھر تن تیرا — کیوں بسیرا ہوا ہے رن تیرا

بوند ملتا نہیں کتیں پانی — سخت طفلاں کے سر پو حیرانی

غم سے تیرے رڈوں زار اصغر اصغر کروں پکار — جیونا مجھ کو ہے دشوار سونا ترا پالنا (ندیم)

دکن کی یہ مثالیں بتدریج ارتقاء کی نشاندہی کر رہی ہیں۔ شمالی ہند میں بھی یہ مرثیے مروج ہوئے اور خود شمالی ہند والوں نے بھی مرثیے کہے۔ بعض مرثیہ نگاروں کا ذکر بعض تذکروں میں ملتا ہے یہاں مسکین، گدا اور سکندر کے نام بحیثیت مرثیہ گو مشہور ہیں ویسے شاہ مبارک، حاتم اور آبرو کے

کلام میں بھی سلام وغیرہ ملتے ہیں۔ مگر بحیثیت مرثیہ گو انہی کو شہرت حاصل تھی۔ سکندر کا مشہور مرثیہ ہے ؎

ہے روایت شتر اسوار کسی کا تھا رسول — ان دنوں شہرِ مدینہ میں ہوا اس کا نزول

میاں مسکین، سودا کے ہم عصر اور کافی مشہور ہیں۔ مرثیہ کہتے تھے اور اس میں جدتیں پیدا کرتے تھے۔ مسدس کی ٹیپ کی بیت اکثر فارسی میں ہوتی تھی۔ مثلاً

جب وداع ہونے لاگی دسویں رات — شہ نے بعد از نوافل و رکعات
تسبیح اوپر پھرایا اپنا ہات — کہا اے چشم و دل کرو طاعات
ہر دم از عمر می رود نفسے
چوں نگہ می کنم نماند بسے

اسی دور میں مصطفیٰ خاں یک رنگ بھی مرثیہ گو تھے۔ مگر سلام کے انداز میں کہتے تھے۔

زخمی برنگِ گل ہیں شہیدانِ کربلا — گلزار کی نمط ہے بیابانِ کربلا
کھانے چلا ہے زخمِ ستم شامیوں کے ہاتھ — دھو ہاتھ زندگی، ستی مہمانِ کربلا

میر و سودا کے عہد سے مرثیے نے ایک کروٹ لی اور یہ ترقی و عروج کی طرف بڑھا۔ میر نے مرثیے کہے وہ بلحاظ تاثیر بلند پائے کے ہیں۔ مگر فنی اعتبار سے اتنے بلند نہیں۔ میر نے داخلی اور خارجی اعتبار سے اس میں اختراعات بھی کی ہیں۔ مسدس مرثیے کا ایک بند دیکھئے ؎

حیدر کا جگر پارہ، وہ فاطمہ کا پیارا — نکلا تھا مدینے سے ناموس لئے سارا
اس چرخ سیہ رو نے اک فتنے کو سنکارا — اِس ظلم رسیدہ کو کس سختیوں سے مارا
کرتا تھا وہ آنکھوں سے خون جگر افشانی — دریا کے کنارے پہ پایا نہ تنک پانی

مرزا محمد رفیع سودا نے فنی حیثیت سے مرثیہ کو کافی ترقی دی ہے اور انھوں نے اس کے لئے اصول و ضوابط کی پابندی کو ضروری قرار دیا تھا کیونکہ انھوں نے خود لکھا ہے کہ فنِ مرثیہ گوئی بہت دشوار ہے۔ گویا انھیں مرثیے کے صحیح مقام و مرتبہ کا احساس تھا۔ وہ مرثیہ گو کی ذمہ داریوں کو سمجھتے تھے۔ وہ مرثیے کو رونے رلانے کی منزل سے آگے بڑھانے میں کوشاں نظر آتے ہیں اور اس

سلسلہ میں وہ میر سے آگے ہیں۔ ان کے کلیات ہیں کافی مرثیے موجود ہیں اور مختلف ہیئتوں میں یعنی مثلث، مربع، مسدس، مستزاد وغیرہ۔ سلام اور رباعیات ان کے علاوہ ہیں۔ مسلسل واقعات بعض مراثی میں ملتے ہیں۔ غرض سودا ہی کے ذریعے مرثیہ کو مستقل مسدس کی ہیئت ملی اور فنی لحاظ سے ترقی پائی۔

کس سے لے چرخ کہوں جاکے تری بیدادی ۔۔۔ جو ہے دنیا میں سو کہتا ہے مجھے ایذادی
ہاتھ سے کون نہیں آج ترے فریادی ۔۔۔ یاں تلک پہنچی ہے ملعون تری بیدادی
کون فرزند علی پر یہ ستم کرتا ہے ۔۔۔ کیوں مکافات سے اسکے تو نہیں ڈرتا ہے

سودا ہی کے زمانے سے مرثیہ کے فن کو عروج حاصل ہونے لگا۔ میر مظفر حسین ضمیر نے اس میں اختراعات کیں۔ اگرچہ وہ تمام جزوی طور پر پائی جاتی تھیں۔ لیکن میر ضمیر نے مرثیے کے حصے مقرر کئے، یعنی چہرہ بزم سراپا۔ آمد، رزمگاہ، رجز، گھوڑے اور تلوار کی تعریف، جنگ، شہادت دعا مرثیہ کے لئے لازمی قرار دیئے۔ بعد کے شعراء نے اسی کو اختیار کیا اور ترقی دی۔ میر ضمیر کا ایک بند پیش ہے۔

قریب جاتے ہی ہندہ نے ان کا تھاما ہاتھ ۔۔۔ کہا سلام علیک اے ضعیفہ نیک صفات
وہاں سے لائی اٹھاکر تو پھر کہی یہ بات ۔۔۔ سمجھ میں کچھ نہیں آتے ہیں آپ کے حالات
وہ روشنی میں بغور ان کے منہ کو تکتی تھی ۔۔۔ اگرچہ قصد تھا پر کچھ وہ کہہ نہ سکتی تھی

ایک شعر اور ملاحظہ کیجئے کیا زور کلام ہے۔

چیر کر فوج کو اس پار سے اس پار گئے ۔۔۔ میں نے خود دیکھا کہ دریا پہ کئی بار گئے

ایک آمد کی شان ملاحظہ کیجئے۔

میداں میں آمد آمد قاسم کی دھوم ہے ۔۔۔ اور زلزلے میں کشورِ سلطانِ رُوم ہے
ارض وسما پہ جن و ملک کا ہجوم ہے ۔۔۔ اک حملے میں بہشت بزیرِ قدم ہے
غل تھا کہ یہ ریاضِ حسن کا نہال ہے ۔۔۔ ابنِ کنندۂ درِ خیبر کا لال ہے

میر ضمیر ہی کے ہم عصر میر خلیق تھے۔ میر حسن کے بیٹے اور میر انیس کے والد۔ میر ضمیر اور میر خلیق اس عہد کے سر برآوردہ مرثیے گو تھے۔ دونوں نے مرثیہ کو اوج و عروج بخشا ہے۔ ان دونوں

بزرگوں کی محنت کا ثمر انیس اور دبیر کی شکل میں رونما ہوا ۔ میر خلیق اور میر انیس کا کلام بلحاظِ زبان بہت بلند ہے اور بعض مقامات پر دونوں میں تمیز کرنا ناممکن ہو جاتا ہے ۔ ملاحظہ فرمائیے :-

گھر سے جب بہرِ سفر سیدِ عالم نکلے | سر جھکائے ہوئے با دیدۂ پُرنم نکلے
خویش و فرزند کمر باندھ کے باہم نکلے | رو کے فرمایا کہ اس شہر سے اب ہم نکلے
رات سے گریۂ زہرا کی صدا آتی ہے | دیکھیں قسمت ہمیں کس دشت میں لے جاتی ہے

لشکرِ یزید کی حالت دیکھئے !

پیاسے پہ مثلِ ابر امنڈ آئے دَل کے دَل | شعلہ صفت چمکنے لگے برچھیوں کے پھل
چلّوں میں تیر کھر کے چلے رَدم دے کے پل | تیغیں اُبل ہوئیں جو کھنچیں ہٹ گئی اجل
دل کو سیاہیٔ شبِ ظلمات ہو گئی | کھولے نشان شامیوں نے رات ہو گئی

میر فصیح بھی ایک اچھے مرثیہ گو اسی دور سے متعلق ہیں ۔

ان بزرگوں کے بعد مرثیہ کے انتہائی عروج کا زمانہ آتا ہے ۔ دبیر و انیس نے اپنی اپنی طبیعتوں کے خوب جوہر دکھلائے اور مرثیے کو ہر حیثیت سے کمال بخشا ۔ مرزا دبیر ۔ میر ضمیر کے شاگرد تھے ۔ علوم متداولہ کی تعلیم حاصل کی تھی ۔ عربی اور فارسی پر عبور حاصل تھا ۔ ان کا کلام فنی حیثیت سے بہت بلند ہے ۔ شکوہِ الفاظ اور بلندیٔ تخیل ان کے کلام کی خاص شان ہے ۔ دردانگیز واقعات لکھنے میں کمال حاصل تھا ۔ مثلاً

جب ہوئی ظہر تلک قتل سپاہِ شبیر | غیرِ اصغر نہ رہا نورِ نگاہِ شبیر
تھی فقط روحِ علی پشت پناہِ شبیر | حق سے کہتے تھے کہ تو رہیو گواہِ شبیر
قتل اصغر ہو میرا سر بھی جدا ہو جائے
اس فریضے سے بھی شبیر ادا ہو جائے

روانہ نہرِ لبن کو جو شیر خوار ہوا | امام زادے کی گردن سے تیر پار ہوا
تڑپ کے ہاتھوں پہ حضرت سے ہمکنار ہوا | خزاں ہوا جو وہ گُل تو گلے کا ہار ہوا
اِدھر تو شاہ کو یہ صدمۂ جگر پہنچا
اُدھر مدینے سے صغرا کا نامہ بر پہنچا

لہو میں غرق ٹکڑے کئے کمر جھکائے ہوئے
پسر کی ننھی سی میت گلے لگائے ہوئے
لہو بھرا ہوا دامن اسے اُڑھائے ہوئے
کفن کی فکر میں منہ خیمہ کو پھرائے ہوئے
یہ حال دیکھ کے قاصد کی آس ٹوٹ گئی
ہوا یہ رعشہ کہ فوراً مہار چھوٹ گئی

دبیر کو رزم لکھنے میں بھی کمال حاصل تھا اوران کی یہ خصوصیت بہت نمایاں ہے۔ فوج یزید کے ایک پہلوان کا رجز سنیئے :

سابق میں سر اٹھایا تھا دارا و سام نے
آئے نہ خواب میں بھی مگر میرے سامنے
رونق یہ پہلوانی کو دی میرے نام نے
بصرہ میں مجھ کو باج دیا خاص و عام نے
قاروں کو جب میں چاہوں بلالوں زمین سے
مثلِ سپر پہاڑ اُٹھالوں زمین سے

نقشۂ جنگ

لیتے ہی نیزہ لینے لگا باج راہوار
صرصر سے جست رعد سے غل برق سے شرار
جلنے لگے زمین پہ ڈر سے سپند وار
دودِ سیاہ اٹھا عوضِ گرد بے شمار
پر ذوالجناح صاف دھویں سے نکل گیا
ہاروت تھا کہ اڑ کے کنویں سے نکل گیا

ایک اور منظر :-

جلدی سے بولہب نے لیا گرزِ گاؤ سر
خیر البشر کا لال اِدھر وہ شقی اُدھر
اور بیچ میں وہ گرزِ گراں بار، الحذر
جس طرح واو عطف کا مابینِ خیر و شر
ظالم ارادۂ سرِ مولا کے لئے ہوئے
اک گرز دونوں ہاتھوں کے اندر لئے ہوئے

وقتِ آخرامام :-

گردِ حسین ہوگئی وہ فوج نابکار
اک سینہ سو دو نیزہ و پیکاں سے ہے فگار
اک جانِ پاک جس کے خریدار سو ہزار
اک حلق جس کے واسطے یہ پیاس بیشمار

اِس پر بھی دعویٰ یہ تھا انھیں یادِ الٰہ کا
کیا حوصلہ تھا سبطِ رسالت پناہ کا

میر انیسؔ کی شہرت اس صنف میں اس قدر ہے کہ انیسؔ اور مرثیہ دونوں لازم و ملزوم ہوکر رہ گئے۔ اور اس میں شک نہیں کہ انیسؔ نے مرثیہ کو اس منزل پر پہنچا دیا کہ آج ہم عالمی ادب کے مقابلہ میں اپنے ادب سے انیسؔ کے مرثیہ کو فخریہ پیش کر سکتے ہیں۔ انیسؔ نے اس صنف میں اتنی محنت کی کردہ سرمایۂ افتخار قرار پائی۔ اس کا احساس انھیں خود بھی تھا۔ لکھا ہے۔

عمر گزری ہے اسی دشت کی سیاحی میں پانچویں پشت ہے شبیر کی مدّاحی میں

بعض حضرات نے جب میر انیسؔ کے شجرۂ نسب پر نظر ڈالی تو انھیں صرف میر خلیقؔ ہی مرثیہ گو کی حیثیت سے نظر آئے اور انھوں نے میر انیسؔ کے دعوے کو تعلّی پر مبنی قرار دے دیا اور کہا کہ ان کے شجرۂ نسب پر نظر ڈالئے تو سلسلہ اس طرح قائم ہوتا ہے۔ انیسؔ، خلیقؔ، میر حسنؔ، میر ضاحکؔ یہاں شعر گوئی کا سلسلہ ختم ہو جاتا ہے۔ ان میں سے میر حسنؔ اور میر ضاحکؔ نے مرثیے نہیں لکھے لہٰذا انیسؔ کا یہ دعویٰ "پانچویں پشت ہے شبیر کی مدّاحی میں" ثابت نہیں۔

بات دراصل یہ ہے کہ ان حضرات نے نہ تو اس مرثیہ کو جس میں یہ بیت ہے بنظرِ غائر ملاحظہ فرمایا اور نہ خاندانِ انیسؔ کے سلسلہ کا مطالعہ کیا اور نہ مشہور تذکروں پر نظر ڈالی۔ اگر ایسا کیا ہوتا تو تمام الجھنیں دور ہو جاتیں۔ پہلے اس مرثیے کے چند بند ملاحظہ فرمائیں تاکہ بات کرنے میں آسانی ہو۔ میر انیسؔ کا مرثیہ مشہور ہے۔

نمکِ خوانِ تکلّم ہے فصاحت میری ناطقے بند ہیں سُن سُن کے بلاغت میری
رنگ اُڑتے ہیں وہ رنگیں ہے عبارت میری شور جس کا ہے وہ دریا ہے طبیعت میری
درد سر ہوتا ہے بیرنگ نہ فریاد کریں
بلبلیں مجھ سے گلستاں کا سبق یاد کریں

ایک قطرے کو جو میں چاہوں تو قلزم کر دوں بحرِ مواجِ فصاحت کا تلاطم کر دوں
ماہ کو مہر کروں ذرّے کو انجم کر دوں گنگ کو ماہرِ اندازِ تکلّم کر دوں
عمر گزری ہے اسی دشت کی سیاحی میں
پانچویں پشت ہے شبیر کی مدّاحی میں

باپ مدّاح کا مدّاح ہے دادا مدّاح — عمِ ذیقدر ثناخوانوں میں یکتا مدّاح
اس ثناخواں کے بزرگوں میں ہیں کیا کیا مدّاح — جدِّ اعلیٰ سے نہ ہوگا کوئی اعلا مدّاح

جو عنایاتِ الٰہی سے ہوا نیک ہوا
نام بڑھتا گیا جب ایک کے بعد ایک ہوا

ان بندوں کے پیشِ نظر پانچویں پشت کا سلسلہ یہ بنا۔ جدِّ اعلیٰ۔ دادا۔ باپ۔ چچا اور خود انیس۔ اب یہ امر غور طلب ہے کہ آیا ان شخصیتوں کو اس ذیل میں لا سکتے ہیں یا نہیں۔ خاندانِ انیس کے مورثِ اعلیٰ میر امامی موسوی تھے اور وہ بھی شاعر تھے۔ ان کے بیٹے میر عزیز اللہ کے متعلق بالیقین تو نہیں کہا جا سکتا مگر گمان ہے کہ وہ بھی شاعر ہوں گے۔ جنہیں شہرت حاصل نہ ہوئی۔ میر ضاحک کی شہرت ہجو نگاری میں ہے، میر حسن کی شہرت بھی مثنوی کی بدولت ہے۔ لیکن اس منزل پر پہنچ کر ہمیں ذرا غور کرنے کی ضرورت ہے کہ ان شعرا کو ایک خاص صنف میں شہرت پا جانے کی وجہ سے دوسری اصناف میں طبع آزمائی کرنے کی تردید نہیں ہو جاتی اور یہ صاف بات ہے کہ میر کی شہرت غزل میں ہے۔ سودا قصیدے کے بادشاہ ہیں لیکن مرثیہ گو بھی ہیں۔ حالانکہ ان کی شہرت اس صنف میں نہیں۔ پس ایسا ہی میر حسن اور ضاحک کے متعلق خیال کرنا چاہئے۔ میر ضاحک سودا اور میر کے ہمعصر ہیں اور مقابلہ و مسابقہ کا جذبہ کارفرما تھا اس لئے بھی میر ضاحک نے ضرور مرثیے لکھے ہوں گے پھر دربارِ اودھ سے وابستہ ہونے کے سبب سے بھی انھوں نے اس میدان میں جوہر دکھائے ہوں گے اور اس رنگ سے میر حسن بھی نہیں بچے ہوں گے کیونکہ عقیدہ اور ماحول اس کا متقضی تھا، یہ اور بات ہے کہ آج ان کے مرثیے نہیں ملتے۔ رام بابو سکسینہ لکھتے ہیں۔

"ہم ابھی ذکر کر چکے ہیں کہ میر امامی، میر ضاحک اور میر حسن نے مرثیے کہے تھے۔ مگر وہ اب نہیں ملتے"۔ (ص ۳۱۸ تاریخ ادب اردو)

اس لحاظ سے میر انیس: میر خلیق، میر حسن، میر ضاحک اور میر امامی اس سلسلہ کی کڑیاں بنتی ہیں لیکن میر انیس نے عمِ ذیقدر کو بھی شامل کیا ہے۔ اس لئے میر خلیق (انیس کے چچا) کے ذریعے بھی یہ سلسلہ پانچ تک پہنچتا ہے، اور بھائی کا ذکر بھی کیا ہے جس سے میر مونس مراد ہیں اس طرح پیڑھیاں پانچ پشتیں ہو جاتی ہیں۔

اس مرثیے کے متعلق ایک روایت مشہور ہے کہ یہ مرثیہ میر انیسؔ نے اپنے بیٹے میر عسکری رئیسؔ کے لئے کہا تھا۔ وہ شاعر تو ضرور تھے مگر مرثیہ کی طرف راغب نہ تھے۔ انہیں رغبت دلانے کے لئے میر انیسؔ نے یہ مرثیہ لکھ کر دیا اور اسے میر رئیسؔ مدت تک پڑھتے رہے نولکشور کے مطبوعہ مراثی انیسؔ میں یہ شامل نہیں ہے۔ سب سے پہلے نظم طباطبائی نے اپنے مجموعے میں شامل کیا، اس خیال کی تائید اس بند سے بھی ہوتی ہے۔

مبتدی ہوں مجھے توقیر عطا کر یارب شوقِ مداحیِ شبیر عطا کر یارب
سلکِ گوہر ہو وہ تقریر عطا کر یارب نظم میں رونے کی تاثیر عطا کر یارب
جدّ و آبا کے سوا اور کی تقلید نہ ہو
لفظ مغلق نہ ہو گنجلک، نہ ہو تعقید نہ ہو

یہ اگر میر عسکری رئیسؔ کا بیان تصور کریں تو رئیسؔ، انیسؔ، مونسؔ (چچا) میر خلیقؔ، میر حسنؔ تک پانچ پشتیں بن جاتی ہیں، گویا میر انیسؔ نے یہ بات بالکل سچ لکھی ہے۔ صرف سلسلہ کی کڑیاں ملانے میں کوشش کرنی پڑتی ہے۔ میر عسکری رئیسؔ نے پھر مرثیے لکھنے شروع کر دیئے تھے۔ ان کا ایک بند ملاحظہ فرمائیے:

آئی نظر سحر کی سپیدی جو ناگہاں نکلے پئے نماز شہنشاہِ دو جہاں
اکبر نے شدّ و مد سے جو صحرا میں دی اذاں آنسو بھر آئے رونے لگے قبلۂ زماں
اُس دم زباں پہ تھا یہ سر اک دل ملول کی
یہ آخری اذاں ہے شبیہِ رسولؐ کی

انیسؔ کو قدرتِ بیان اور فصاحت و بلاغت ورثے میں ملی تھی اور انھیں اپنی زبان پر ناز تھا۔ وہ بھری محفل میں کہا کرتے تھے کہ حضرات یہ میرے گھر کی زبان ہے۔ حضراتِ لکھنؤ اس طرح نہیں فرماتے۔ یہ زبان سلاست، فصاحت اور بلاغت سے مملو تھی۔ انہیں محاورے اور روزمرّہ پر بڑی قدرت حاصل تھی۔ بہت سی نئی ترکیبیں ان کی اختراع ہیں۔ تمام عنوانات تو نہیں صرف ایک دو بند تبرکاً پیشِ خدمت ہیں۔ مثلاً خصوصیاتِ زبان اور مرثیہ کی تعریف میں فرماتے ہیں۔

روزمرّہ شرفا کا ہو سلاست ہو وہی لب و لہجہ وہی سارا ہو متانت ہو وہی

سامعیں جلد سمجھ لیں جسے صنعت ہو وہی　　یعنی موقع ہو جہاں جس کا عبارت ہو وہی
لفظ بھی چست ہوں مضمون بھی عالی ہووے
مرثیہ درد کی باتوں سے نہ خالی ہووے

بزم کا رنگ جدا رزم کا میداں ہے جدا　　یہ چمن اور ہے زخموں کا گلستاں ہے جدا
فہم کامل ہو تو ہر نالے کا عنواں ہے جدا　　مختصر پڑھ کے رُلا دینے کا ساماں ہے جدا
دبدبہ بھی ہو مصائب بھی ہوں توصیف بھی ہو
دل بھی محفوظ ہوں رقت بھی ہو تعریف بھی ہو

انیس کے بعد آج تک مرثیہ گوئی کا سلسلہ قائم ہے لیکن اس میں کوئی خاص تبدیلی بلحاظِ ہیئت واقع نہیں ہوئی۔ پیارے صاحب رشید نے مرثیہ کے اجزاء میں ساقی نامہ کا اضافہ کیا۔ اور مرزا اوج نے موضوعات میں تبدیلی کی ابتدا کی۔ دور جدید میں بعض مرثیہ نگاروں نے فلسفۂ شہادت اور حالات حاضرہ کو بھی مرثیے کا موضوع بنا کر وسعت و جدت کے اظہار میں نمایاں حصہ لیا ہے۔ جوش ملیح آبادی نجم آفندی کو زیادہ شہرت حاصل ہے۔ سید آل رضا نے بھی اس طرف اقدام کیا ہے، ڈاکٹر صفدر حسین بھی اسی کوشش میں لگے ہوئے ہیں۔ نسیم امروہوی اگرچہ قدیم رنگ میں اچھا کہتے ہیں ان کے ہاں بھی فلسفہ و حالات کا ذکر ہے لیکن انھوں نے اس کو موضوع نہیں بنایا بلکہ ضمناً حسب ضرورت ذکر آجاتا ہے۔

اردو ادب میں کافی انقلاب آچکا ہے، جدید نظم اور آزاد نظم نے ہیئت و مواد کے جو تجربے پیش کئے ہیں ان کا اثر بہت ہے اور ہر صنف سخن متاثر ہے، ۱۸۵۷ء کے بعد ادبی ترقی میں واقعاتِ کربلا شعوری طور پر مسلمانوں کو بالخصوص اور بنی نوع انسان کو بالعموم بیدار کرنے کا موثر ذریعہ ثابت ہوئے ہیں، مولانا محمد علی جوہر اور علامہ اقبال، مولانا ظفر علی خاں اور دوسرے معتدد شعرا کے کلام میں اس کی مثالیں موجود ہیں بلکہ علامہ اقبال کی شاعری میں تو بہت زیادہ ہے۔ واقعۂ کربلا ہمارے ادیبوں اور شاعروں کے لئے ایک علامت بن چکا ہے۔ جب بھی حق و باطل کا معرکہ پیش آتا ہے تو حق کی حمایت کی نمائندگی کیلئے کربلا اور حسینؑ ہی علامت بنتے ہیں، چنانچہ آج کشمیر اور ویت نام کے معرکوں کی حقیقت و اہمیت اور کربلا کی ظلم و تعدی کے اظہار کے لئے کربلا ہی بطور علامت استعمال کرتے ہیں، آزاد نظم میں بعض نظموں کو مرثیہ کہا گیا ہے لیکن یہ حقیقت ہے کہ امام حسین علیہ السلام بنی نوع انسان کے لئے ایک نمونہ ہیں کہ حق و صداقت کی حفاظت اور آزادی کے لئے بنی نوع انسان کو مسلکِ شبیری اپنائے بغیر چارہ نہیں، ایسی نظموں کو بادی النظر میں گو مرثیہ نہ کہا جائے لیکن اپنے موضوع کے اعتبار سے انھیں بآسانی مرثیوں میں شامل کیا جاسکتا ہے۔

مرثیہ ـــ ایک بیانیہ شاعری

الیاس عشقی

اردو کی کلاسیکی شاعری میں اگر کوئی صنف ایسی ہے جس کے متعلق یہ کہا جا سکے کہ وہ فارسی اصناف شاعری سے مستعار نہیں لی گئی ہے تو وہ مرثیہ ہے۔ مرثیہ ہر چند کہ مسدس میں اپنے کمال کو پہنچا ہے۔ لیکن یہ یقین کے ساتھ کہا جا سکتا ہے کہ اردو شاعری میں مسدس سے جو کام لیا گیا ہے اس کی نظیر فارسی شاعری میں موجود نہیں ہے۔ فارسی شاعری میں محتشم کاشی نے واقعات کربلا کو ترکیب بند کی صنف میں قلم بند کیا اور بڑی حد تک اپنی شاعرانہ ذمہ داریوں سے کامیابی کے ساتھ عہدہ برآ ہوا۔ لیکن اس ابتدائی شاعری خاندانِ انیس کے صنف مسدس کو اپنانے سے قبل اردو میں غزل کی صنف میں مل جاتی ہے۔ صرف سودا کے کلام کے مطالعے سے یہ بات واضح ہو جاتی ہے۔ لیکن خلیق، ضمیر اور ان کے خاندان کے شعرا نے مسدس کو اپنا کر مرثیے میں ایک تیسرا البعد پیدا کر دیا۔ جس کی وجہ سے مرثیے میں ایک نئی روح پیدا ہو گئی۔ یہ تیسرا البعد اس ڈرامائی عنصر کی وجہ سے پیدا ہوا جو خاندان انیس کی خصوصیت ہے اور جس کی مثال اردو ادب میں موجود نہ تھی۔ ڈرامائی عنصر اگر اردو شاعری میں مرثیے سے پہلے مل جائے تو اُسے محض اتفاق سمجھنا چاہیئے۔

خلیق اور ضمیر کے مراثی کے مطالعے سے یہ معلوم ہو جاتا ہے کہ اگر اردو ادب میں ڈرامے کا رواج ہوتا تو وہ اور ان کے خاندان کے دوسرے شعرا بہترین ڈرامہ نگار ثابت ہوتے۔ لیکن اگر ایسا ہوتا تو اردو شاعری یقیناً ایک ایسی صنف سے محروم ہو جاتی جس پر آج اسے بجا طور پر ناز ہے اس وجہ سے بھی کہ ایسی صنفِ شاعری کسی اور زبان میں موجود نہیں ہے۔

مرثیے کے کینوس بہت وسیع ہیں اور اس کے موضوعات لامحدود ہیں کیونکہ یہ زندگی کا عکاس

ہے اور زندگی لامحدود امکانات سے عبارت ہے۔ شاعری میں زندگی کے یہ امکانات ہمیشہ موجود رہتے ہیں۔ لیکن مرثیے کا امتیاز یہ ہے کہ صرف ایک واقعہ کے بیان تک ہونے کے باوجود زندگی کی بہت سی وسعتوں کو سمیٹے ہوئے ہے۔ یہ واقعہ ایک ایسی جنگ پر مشتمل ہے جس میں ایک زبردست لشکر، چند نفوس سے جنگ آزما ہوتا ہے۔ نتیجہ ظاہر ہے۔ لیکن اس جنگ میں فتح و شکست کا فیصلہ بظاہر فتح حاصل کرنے والوں کے خلاف ہوتا ہے۔ کیونکہ یہ جنگ ایک اصول کی تیج پر منتج ہوئی ہے۔ معدودے چند برگزیدہ نفوس جو جنگ کے انجام سے واقف ہیں ایک اصول کے لئے بڑی شجاعت سے لڑتے ہوئے جان دیتے ہیں اور جنگ کی تاریخ میں ایک سنہری باب کا اضافہ کر جاتے ہیں۔ اس طرح مرثیے کا خاص موضوع جنگ ہے جو فردوسی اور نظامی جیسے شعراء کے کلام میں بھی درجۂ کمال پر نظر آتا ہے۔ لیکن مرثیے میں یہ موضوع بڑے انوکھے انداز میں آیا ہے۔ یہاں دونوں لشکروں میں بظاہر جو فرق نظر آتا ہے وہ اس جنگ کو ہومر، فردوسی اور نظامی کی جنگوں سے مختلف بنا دیتا ہے۔ حضرت امام کا لشکر بہت مختصر ہے اور ان کے ہم راہ عورتیں اور بچے بھی ہیں۔ جو بڑی پامردی سے اس واقعہ میں اپنا کردار ادا کرتے ہیں اور اپنے بے مثال استقلال اپنی ہمت و شجاعت اپنی مظلومیت اور بیکسی کے سہارے اپنے خون سے ایک ایسی داستان رقم کرتے ہیں جو تاریخ عالم میں اپنی مثال آپ ہے۔

کربلا کی کہانی کا ہر کردار ایک انفرادیت اور عظمت رکھتا ہے جسے مرثیہ گو شعراء نے بڑی چابکدستی اور مہارت فن کے ساتھ ابھارا ہے۔ اس طرح کردار نگاری کے اعتبار سے بھی مرثیے میں ایک ڈرامائی عظمت پیدا ہو گئی ہے، مرثیے کے مخصوص کرداروں میں حبیب ابن مظاہر، حُر، حضرت قاسم، حضرت علی اکبر، حضرت عباس۔ حضرت عون حضرت محمدؑ، حضرت علی اصغر اور سید الشہداء حضرت امام حسین علیہ السلام کے کردار جس طرح تاریخ میں زندۂ جاوید ہیں اسی طرح اردو مرثیے میں زندہ اور پائندہ رہیں گے۔ دنیا کے کسی ڈرامے اور کسی جنگ نامے میں کرداروں کا یہ تنوع یکجا نظر نہیں آیا شیر خوار بچے علی اصغر سے لے کر بوڑھے حبیب ابن مظاہر تک ہر عمر کے لوگ موجود ہیں اور مرثیہ نگاروں نے اپنے فن کے ذریعے ان کرداروں کو زندہ اور پُر عظمت بنانے میں کوئی کسر اٹھا نہیں رکھی ہے۔

مرثیے کے یہ کردار خاندانی اور معاشرتی رشتوں کے علاوہ ایمانی اور اخلاقی قدروں کے ایسے زبردست انسانی رشتوں میں منسلک ہیں جو ان کی عظمت کے محافظ ہیں۔ آقا، خادم، خورد و بزرگ، دوست، بھائی بہن اور دوسرے انسانی رشتے جو مصیبت کے وقت کمزور ہو جاتے ہیں یہاں مصیبت کے وقت اور مضبوط و مستحکم ہو جاتے ہیں۔ ہر شخص حضرت امامؑ پر جان نثار کرنے میں ایک دوسرے پر سبقت لے جانا چاہتا ہے۔ مگر حفظِ مراتب کو ہاتھ سے جانے نہیں دیتا۔ اس خصوصیت نے محاکاتِ واقعیت اور جذبات نگاری کا ایک ایسا معیار قائم کر دیا ہے جو اردو مرثیے کی ناقابلِ اشتراک خصوصیت بن گیا ہے۔

محاکات کے سلسلے میں منظر نگاری خاص کر موسم اور وقت کے بیان میں مشاہدے کی جس صداقت کے ثبوت ملتے ہیں ان کی مثال دنیا کی بہترین شاعری ہی میں مل سکتی ہے۔ اور یہ سب کچھ زبان کے سہارے ممکن ہوا جو فصاحت اور بلاغت میں ضرب المثل بن کر رہ گئی ہے۔

مرثیے کی یہ تمام خصوصیات انیسؔ کی شاعری میں اپنے نقطۂ عروج تک پہنچی ہیں اور ان خصوصیات کے مدِنظر انیسؔ کی شاعری کا جائزہ لینا آسان نہیں ہے۔ اس لئے گفتگو کے دائرے کو محدود کر لینا مناسب ہے۔

مرثیہ بیانیہ شاعری ہے اور بیانیہ شاعری میں ڈرامائی عنصر بہت حد تک محدود و مجروح ہو جاتا ہے۔ اسے ہومر، والمیکی، فردوسی، نظامی اور تلسی داس جیسے بڑے شاعر ہی کامیابی سے نباہ سکتے ہیں۔ اس مختصر سے جائزے میں ہمیں صرف یہ دیکھنا ہے کہ حضرت امام حسینؑ کے مختصر اور بے سر و سامان قافلے نے مدینے سے کربلا تک کا سفر کس طرح طے کیا۔ یہ سفر میل و فرسنگ ہی کا نہیں بلکہ انسانی جذبات اور احساسات کا سفر بھی ہے۔ یہ سفر کس طرح طے ہوتا ہے اسے انیسؔ کی شاعری میں ملاحظہ کیجئے۔

برپا ہے مدینے میں تلاطم کئی دن سے — ہے راحت و آرام و طرب گم کئی دن سے
ہر گھر میں ہے اک شورِ تظلم کئی دن سے — منہ ڈھانپے ہوئے روتے ہیں مردم کئی دن سے
وہ غم ہے کہ آرام کا جویا نہیں کوئی
راتیں کئی گذری ہیں کہ سویا نہیں کوئی

کہتا ہے کوئی کیا ہوا یہ بیٹھے بٹھائے — کیا جانیے خط کوفے سے کس طرح کے آئے
روضے پہ نبی کے شہِ دیں رہنے نہ پائے — کچھ ایسا ہو یارب کہ یہ مظلوم نہ جائے
کوفے میں محبت نہ مروت نہ حیا ہے
خط مکر کے لکھے ہیں بلانے میں دغا ہے

در پر کوئی روتا ہے کوئی راہ گزر میں — تاریک ہے دنیا کسی غمگیں کی نظر میں
ہیں جمع محلے کی جو سب بیبیاں گھر میں — اک حشر ہے ناموسِ شہِ جن و بشر میں
سب مل کے بکا کرتے ہیں جب آتا ہے کوئی
یوں روتے ہیں جس طرح کہ مر جاتا ہے کوئی
سب کہتے ہیں زینب سے کہ اے شاہ کی شیدا — کس طرح کے خط آئے یکایک یہ ہوا کیا
پانی کی کمی گرمی کے دن خون کا رستا — وہ دھوپ پہاڑوں کی وہ لو اور وہ صحرا
کیا سوچ کے اس مقتل میں شبیر چلے ہیں
بچوں پہ کرو رحم کہ نازوں کے پلے ہیں

دور دراز کا سفر اور راہوں کی صعوبت کے خیال سے ہر شخص ہراساں ہے۔ عورتوں اور بچوں کا ساتھ اور کوفے والوں کی بے مروتی اور فطری دھوکہ بازی کی وجہ سے طرح طرح کے خدشے اور اندیشے پیدا ہوتے ہیں۔ ادھر مدینے کے لوگوں اور اہل محلہ کا یہ حال۔ اس طرف گھر کے افراد اس خیال سے دم بخود ہیں کہ حضرت امام کسے ہمراہی کا شرف بخشتے ہیں۔ صغرا کو اپنی بیماری کی وجہ سے یہ خیال پیدا ہوتا ہے کہ شاید بیماری کی وجہ سے اسے ساتھ لے جانا مناسب نہ سمجھا جائے۔ چنانچہ اس نے کہنا شروع کر دیا کہ صحت اب پہلے سے بہتر ہے اور اگر تھوڑی سی نقاہت باقی بھی ہے تو کوئی حرج نہیں ہے وہ آسانی سے سفر کر سکے گی۔ اس نے ایک ایک کو محبت اور رشتہ کا واسطہ دے کر ایسے جذباتی انداز میں ساتھ جانے کی درخواست کی کہ پتھر پانی ہوتا تھا۔ اسکے بعد اہل بیت سفر کے لئے تیار ہوتے ہیں۔ حضور اپنے نانا پیغمبر آخر الزماں کے روضے پر حاضر ہوتے ہیں اور وہاں سے واپسی پر اپنے برادر بزرگ حضرت امام حسن کی قبر شریف

لے جاتے ہیں۔ وہاں سے واپسی پر اہل بیت کے ساتھ مدینے سے مکّے کی جانب روانہ ہوتے ہیں یہ روانگی قیامت کا سماں پیش کرتی تھی ۔

تھا نانکے تلک شہر کے اک شورِ قیامت سمجھاتے ہوئے سب کو چلے جاتے تھے حضرت
رو رو کے وہ کہتا تھا جسے کرتے تھے رخصت پائیں گے کہاں ہم یہ غنیمت ہے زیارت
آخر کو بچھڑ کر کفِ افسوس ملیں گے
دس بیس قدم اور بھی ہمراہ چلیں گے

قسمیں انھیں دے دے کے کہا شہ نے کہ جاؤ تکلیف تمھیں ہوتی ہے اب ساتھ نہ آؤ
اللہ کو سونپا تمھیں آنسو نہ بہاؤ پھرنے کے نہیں ہم سے بس اب ہاتھ اٹھاؤ
اُس بیکس و تنہا کی خبر پوچھتے رہنا
یارو مری صغرا کی خبر پوچھتے رہنا

روتے ہوئے وہ لوگ پھرے شاہ سدھارے جو صاحب قسمت تھے وہ ہمراہ سدھارے
کس شوق سے مردانِ حق آگاہ سدھارے عابد طرفِ خانۂ اللہ سدھارے
اترے نہ مسافر کسی مخلوق کے گھر میں
عاشق کو کشش لے گئی معشوق کے گھر میں

مدینے سے روانہ ہو کر مکّے اس شان سے پہنچتے ہیں ؎

روشن ہوئی کعبہ کی زمیں نورِ خدا سے مکّے نے شرف اور بھی پایا شرفا سے
جھک جھک کے ملے سبطِ پیمبر غربا سے آباد ہوا شہر نمازوں کی صدا سے
خوش ہو کے ہوا خواہ یہ کہتے تھے علیؑ کے
سب باپ کی خوبو ہے نواسے میں نبیؐ کے

کعبے میں مدینے سے یہی سوچ کے آئے تھے اہلِ حرم کو بھی اسی واسطے لائے
اللہ کے گھر میں کوئی شاید نہ ستائے سو واں بھی یہ تھا خوف کہ حج کرنے نہ پائے
اللہ نے پیدا کیا کعبے میں علیؑ کو
اور جائے سکونت نہ ملی سبطِ نبیؐ کو

مضطر تھے شبِ ہشتم ذی الحجہ کو شبیر | تھا قصد مصمم کہ سوئے کوفہ ہوں رہگیر
کرتے تھے کبھی یاس سے رو رو کے یہ تقریر | اب یاں سے کہاں دیکھئے لے جاتی ہے تقدیر

پھر کر جو وطن جائیں تو جانا نہ ملے گا
اب ہم کو بجز قبر ٹھکانا نہ ملے گا

اسی رات حضرت امام کوچ کی تدبیر کرنے لگے اور اس سلسلے میں حضرت محمد بن حنفیہ سے ملاقات کی اور حضرت نے امام عالی مقام کو کوفے تشریف لے جانے کی رائے دی۔ جناب امام نے فرمایا کہ اب مکّے اور مدینے میں بھی حالات ناساز گار ہیں یہ سن کر حضرت حنفیہ نے آپ کو یمن تشریف لے جانے کا مشورہ دیا۔ جناب امام عالی مقام نے فرمایا میں کہیں جاؤں موت میرا پیچھا کرے گی جو اللہ کو منظور ہے وہی ہوگا۔ وہ حق میں آگے ہی بڑھنا ہے۔ چنانچہ حضور نے کوچ کی تیاری شروع کردی۔ اور صبح سویرے روانہ ہوگئے۔ ہر چند کہ آپ کو سفر کی صعوبت اور عورتوں اور بچّوں کی ہمراہی سے پیدا ہونے والے مسائل کا اندازہ تھا، لیکن مشیت ایزدی کے سامنے سرِ تسلیم خم تھا۔ کوچ سے پہلے پھر حضرت محمد بن حنفیہ نے ہر قسم کے واسطے دے کر سفر سے باز رہنے کی کوشش کی۔ یہ گفتگو سن کر اہل حرم میں گریۂ بکا شروع ہوگیا اور بچے بھی پھوٹ پھوٹ کے رونے لگے۔ اسی عالم میں جناب امام عالی مقام مکّے سے اس طرح روانہ ہوگئے ؎

ہر سمت سے جوں جوں یہ بیاں کرتی تھی خلقت | گھوڑے پہ چلے جاتے تھے روتے ہوئے حضرت
ہر ایک سے فرماتے تھے یہ تھام کے رقت | تم سب سے بھی شبیر کی ہے آخری رخصت

اپنوں سے چھٹا، حال نہ کیوں غیر ہو میرا
مانگو یہ دعا خاتمہ بالخیر ہو میرا

اس طرح رخصت ہو کر جگر گوشۂ مصطفیٰ و علی کربلا کی جانب روانہ ہوئے آبادی سے دور ہوئے تو قدرتی مناظر نے اس قافلے کو اپنے آغوش میں لے لیا ؎

یہ کہہ کے روانہ ہوئے وہ خالقِ باری | گویا کہ بیاباں میں چلی بادِ بہاری
جنگل میں کھلا باغ یہ خوشبو ہوئی ساری | فیاض نے صحرا کی بھی کی کار برآری

مہکے جو وہ گیسو تو بیاباں کی بن آئی
نافے لئے جھولی میں نسیم ختن آئی

اونٹوں کو بھی تھا وجد حدی خواں کی صدا سے — گھوڑے بھی ترارون میں کچھ آگے تھے ہوا سے
غافل نہ تھا لشکر میں کوئی یاد خدا سے — صاف آتی تھی تکبیر کی آواز درا سے

صحرا اٹھا دم ظہر کہ دامن تھا جبل کا
غل ہوتا تھا اک حی علیٰ خیر عمل کا

لیکن ایسے عالم میں اہل قافلے میں یہی گفتگو ہوتی رہی کہ حضور کا مکے یا مدینے میں رہنا مناسب تھا یا یہ سفر صعوبت اثر اختیار کرنا۔ اسی طرح قافلہ بڑھتا رہا۔ اب گرمی رفتہ رفتہ بڑھنے لگی اور صحرائے عرب کی جھلسا دینے والی ہوائیں چلنے لگیں اس شدت کے موسم میں لوگوں کو پریشان دیکھ کر حضرت امام عالی مقام نے ان کی گفتگو سنی تو آپ نے ان سے یوں خطاب فرمایا ؎

فرماتے تھے حضرت تمھیں خالق رکھے آباد — دنیا میں برومند ہو ایک ایک کی اولاد
کیا اپنی تباہی کہوں میں بیکس و ناشاد — رو دو گے مفصل جو سنو گے مری روداد

درپیش ہے وہ راہ کہ کچھ کہہ نہیں سکتا
بے کنج لحد اب میں کہیں رہ نہیں سکتا

ہر چند کہ لو چلتی ہے اٹھتے ہیں بگولے — اشجار خزاں دیدہ بھی اب تک نہیں پھولے
پڑ جاتا ہے چھالا کوئی آہن کو جو چھولے — تم لوگوں کی ایسی نہیں الفت کہ جو بھولے

موت آئی تو بر میں کسی صحرا کے رہیں گے
جیتے جو پھرے ہم تو یہیں آ کے رہیں گے

اور پھر سفر کی وہی صعوبتیں اور موسم کی وہی شدت ؎

پتھر کی چٹانوں سے نکلتے تھے شرارے — ناری تھی ہوا سبز شجر زرد تھے سارے
ڈر یہ تھے عرق میں اسد اللہ کے پیارے — دھڑکا تھا کہ یوں لو کسی بچے کو نہ مارے

ہوش اتنا نہ تھا اصغر معصوم کو غش سے
اودے تھے لب لعل سکینہ کے عطش سے

ایک طرف موسم کی شدت اور دوسری جانب دشمنوں کی چیرہ دستیاں حد سے بڑھی ہوئی نظر آتی تھیں جناب امام جانتے تھے کہ اہل کوفہ کا ارادہ کیا ہو سکتا ہے۔ اس لئے ہر راہ گیر سے کچھ اس قسم کی باتیں ہو جاتی تھیں ؎

غربت کی جفائیں یونہی سہتے ہوئے دن رات طے راہِ خدا کرتے تھے شبیرؑ خوش اوقات
ہو جاتی تھی جس مردِ مسافر سے ملاقات گھوڑے کی عناں روک کے فرماتے تھے یہ بات

ٹھہرا نہیں سکتا کہ سرِ راہ ہے بھائی
کوفے کی خبر سے بھی کچھ آگاہ ہے بھائی

وہ کہتا تھا کوفے میں عجب غدر ہے مولا ہر سمت ہیں قضیے تو فساد اٹھتے ہیں ہر جا
دور اُن کا ہے کچھ جن کو مروت نہیں اصلا ہوتے ہیں ستم کوئی کسی کی نہیں سنتا

بے جرم ستاتے ہیں محبانِ علیؑ کو
غل ہے کہ چھپائے نہ کوئی گھر میں کسی کو

اطراف سے فوجیں چلی آتی ہیں برابر ثابت نہیں ہوتا کہ چڑھائی ہے کسی پر
باغات میں کوفے کے پڑے ہیں کئی لشکر ناکے سے نکلنے نہیں پاتا کوئی باہر

تیغیں بھی چمکتی ہیں سنانیں بھی تبر بھی
رُخ ایک رسالے کا تو دیکھا ہے اِدھر بھی

غرض راہ میں اسی قسم کی وحشت ناک خبریں مل رہی تھیں ؎

دم بھر کہیں دم لے لیا جب دوپہر آئی راہی ہوئے پھر دھوپ جو بالائے سر آئی
لیکن کہیں راحت کی نہ صورت نظر آئی جب آئی خبر راہ میں وحشت اثر آئی

مشتاق تھے جس کے خبر آئی کہ مرا وہ
جس دوست کو پوچھا یہ سنا قتل ہوا وہ

اور آخر وہ خبر وحشت اثر بھی ملی جس کے بعد آنے والے واقعات کا اندازہ لگانا مشکل نہ رہا ؎

جب منزلِ حاضر سے بڑھے سبطِ پیمبر آئی یہ مفصل خبرِ مسلمِ بے پر

دنیا سے گیا آٹھویں تاریخ وہ صفدر　　فرزند مصیبت میں ہوئے ظلم سے بےسر

ماتم ہے کئی دن سے مسلمانوں کے گھر میں

خندق میں تو لاش اس کی ہے سر قلعہ کے در میں

اس خبر سے اہل بیت میں صف ماتم بچھ گئی جو حال ہوا اس کی ایک جھلک ان بندوں میں ملاحظہ فرمائیے ؎

اس قافلے میں رونے کا اک شور ہوا جب　　گھبرا گئے ناموس رسول عربی سب

غل پڑ گیا پردیسیوں کی خیر ہو یارب　　دوڑی گئی سر کھولے در خیمہ پہ زینب

چلاتی تھی کیوں حشر یہ برپا ہوا لوگو

کس کی خبر آئی ہے ارے کیا ہوا لوگو

زینب کے قریں زوجۂ مسلم بھی کھلے سر　　کہتی تھی غضب ہو گیا اے شاہ کی خواہر

چلتی تھی چھری آٹھویں تاریخ سے مجھ پر　　میں رانڈ ہوئی لٹ گیا کونے میں مرا گھر

دو بچوں کے دنیا سے گذرنے کی خبر ہے

یہ ایلچی شاہ کے مرنے کی خبر ہے

ان حالات کو دیکھتے ہوئے جناب امام نے کوچ کا حکم دیا، اونٹوں کو پانی پلایا، مشکیں پانی سے بھرلیں تھوڑی دور چلے تھے کہ ایک دلاور نے گھوڑے پر تکبیر کہی۔ آپ نے اس سبب دریافت کیا تو اس نے کہا کہ سامنے کوفے کے نخلستان نظر آرہے ہیں۔ اس پر دوسروں نے کہا کہ نہیں یہ خرمے کے درخت نہیں ہیں۔ حضرت عباس علمدار نے فرمایا کہ یہ تو کوئی فوج نظر آتی ہے جسے یہ شخص کھجور کے درختوں کی چوٹیاں سمجھ رہا ہے وہ سنانوں کی نوکیں اور گھوڑوں کی کنوتیاں ہیں۔ حضور نے فرمایا۔ تم سچ کہتے ہو یہ فوج ہمارے لئے کوفے سے بھیجی گئی ہے، جنگ ضرور ہوگی۔ اس لئے یہیں خیمے برپا کر دیئے جائیں۔ جب وہ لشکر قریب آیا تو حضرت عباس نے اسے للکارا کہ لشکر آگے نہ بڑھے اور اگر کوئی جناب امام سے ملنے کا خواہشمند ہو تو وہ گھوڑے سے اتر کر پیدل آئے اور ہتھیار ساتھ نہ لائے۔

سن کے پکارا اسد اللہ کا ضرغام　　تم لوگوں میں سردار ہے کون اے سپہ شام

خود جوڑ کے ہاتھوں کو یہ بولا وہ خوش انجام سردار ہوں اس فوج کا میں حر ہے میرا نام
دعوائے غلامی ہے مجھے آل نبی سے
عفو ہے مجھے مجبوب ہوں اس بے ادبی سے

اور اس کے بعد حُر نے صورتِ حال سے مطلع کیا ؎

تب حُر نے یہ کی عرض کہ اے خاصۂ داور بھیجا ہے مجھے حاکم کوفہ نے یہ کہہ کر
رستے میں جہاں تجھ کو ملیں سبطِ پیمبر تو ساتھ سے انکے نہ جدا ہوجیو دم بھر
یثرب تو کجا سوئے نجف جانے نہ دینا
کوفے کے سوا اور طرف جانے نہ دینا

جنگل میں شب باشی کی یہ عجیب کیفیت تھی رات گئے تک لوگوں کو نیند نہ آئی آخر لوگ سو گئے، حضرت عباس پھر بھی جاگتے رہے ناگاہ رات کے اندھیرے میں کسی کی آمد کا احساس ہوا تو آپ نے للکارا ؎

نعرہ کیا ابن اسد اللہ نے بڑھ کر کون آتا ہے بتلا نہیں موت آتی ہے سر پر
تھرائے بڑھا ہاتھوں کو جوڑے وہ دلاور کی عرض کہ میں حُر ہوں غلامِ شہِ صفدر
کر دیجے خبر ابن شہنشاہ عرب کو
کچھ عرض ضروری ہے کہ میں آیا ہوں شب کو

جب استفسار کیا تو حُر نے خدمتِ والا میں حاضری کا اشتیاق ظاہر کیا تو حضرت عباس امام عالی مقام کی خدمت میں حاضر ہوئے۔

عباس اسے ساتھ لئے ڈیوڑھی پہ آئے خیمے میں گئے اور سخن لب پہ یہ لائے
حُر آتا ہے اے حیدر کرار کے جائے ارشاد اگر ہو تو رضا آنے کی پائے
فرمایا کہ بے مکر و شر آتا ہے بلالو
گمراہ تھا اب راہ پر آتا ہے بلالو

حُر نے حاضر ہو کر اعدائے امام حسینؑ کے ارادوں اور ان کی فوجی تیاریوں سے مطلع کیا اور بتایا کہ اشرار حضورؑ کے قتل کا ارادہ رکھتے ہیں بہتر ہے کہ آپ یہاں سے کسی طرف نکل چلئے ؎

سب سوتا ہے لشکر بھی مرا یا شہِ ابرار — بہتر ہے اسی وقت اگر ہو جیئے اسوار
فرمایا کدھر جاؤں میں اے حُرِ وفادار — جو ہوئے سو ہو اب تو ہوں آفت میں گرفتار

منظور جسے ہو مرا تن کاٹ لے سر سے
مرنے کے ارادے سے تو آیا ہوں وطن سے

یہ سن کر حُر ملول ہوا اور اس کی آنکھوں سے آنسو جاری ہو گئے اس پر حضرت امام نے فرمایا ؎

کچھ سوچ کے فرمانے لگے سبطِ پیمبر — اے دوست یہی رائے تری ہے تو ہے بہتر
جائیں گے جدھر ساتھ اجل ہو گی مقرر — دیکھیں یہ شب تار بسر ہوتی ہے کیوں کر

کس کو خبر اس کی کہ کہاں قبر بنے گی
پر ہو گی وہیں صبح جہاں قبر بنے گی

اس طرح رات کی تاریکی میں یہ لشکر اپنی آخری منزل کی جانب روانہ ہوا یہ سفر صعوبت کے اعتبار سے دشوار ترین، سفر ثابت ہوا۔ امام عالی مقام نے ان دو پہروں میں گھوڑا بھی تبدیل فرمایا ؎

یوں دشت میں پھرتے تھے وہ اللہ کے پیارے — جس طرح کریں سیر شب تار میں تارے
ماندے ہوئے رہوار بھی سب اونٹ بھی پیارے — سادات نے وہ دو پہر آنکھوں میں گذارے

گردش میں کٹی رات ولی ابن ولی کی
مقتل میں ہوئی صبح حسین ابن علی کی

اور آخر کار یہ سفر اس طرح ختم ہوتا ہے ؎

یہ سنتے ہی رہوار سے اترے شہِ ابرار — فرمایا کہ بس کھول دو اونٹوں کے یہیں بار
طالب تھا یہیں کا بسر صفدرِ کرار — عباس سے فرمایا کہ اترو مرے غم خوار

ہووے گا مقام اب یہیں حیدر کے پسر کا
لو شکر کرو خاتمہ ہے آج سفر کا

اور حضرت نے قافلے والوں سے فرمایا ؎

اے قافلے والو یہ ٹھہرنے کی جگہ ہے — خیمے کرو برپا یہ اُترنے کی جگہ ہے

دینداروں کے یہ سر سے گذرنے کی جگہ ہے ہمت جو خدا دے تو یہ مرنے کی جگہ ہے
ایسی نہ زمیں پھر تہِ افلاک ملے گی
یہ خاک وہ ہے جس میں مری خاک ملے گی

یہ مقام کربلا تھا جہاں ہوا کے جھکڑ چل رہے تھے اور ہر طرف وحشت برس رہی تھی یہیں خیمے برپا کئے گئے ؎

فرما کے یہ حضرت اسی صحرا میں پھر آئے فراشوں نے جھاڑی وہ زمیں اونٹ بٹھائے
خیمے کئے استادہ سراچے بھی لگائے اور ڈیوڑھی پہ ناموس کے حجازوں کو لائے
پاس آکے گھٹا ٹوپ کو گرواتے تھے عباسؑ
ہر بی بی کو محمل سے اترواتے تھے عباسؑ

سیدانیاں خیموں میں تشریف لے گئیں۔ ایسے دشتِ بلا میں ان کا گھبرانا فطری تھا سیدانیاں اور بچے سہمے جاتے تھے۔ جناب زینب سب کو تسلی دیتی تھیں کہ اللہ کا جو حکم اس کے آگے سر تسلیم خم کرنا ضروری ہے۔ اسی دوران کسی نے آکر خبر کی کہ نہر فرات پر کوفے کی فوج نے ابھی پڑاؤ ڈالا ہے جس میں چار ہزار زرہ پوش سپاہی ہیں اور دشمنوں کا پرچم لہرا رہا ہے۔ اس پر حضرت عباسؑ اور حضرت علی اکبرؑ نے تشویش کا اظہار کیا۔ اتنے میں نقاروں اور گھوڑوں کے ہنہنانے کی آواز صاف سنائی دینے لگی۔ دو دن اس طرح گذرے تیسرے دن پانچویں محرم کو سپاہ شام بھی آپہنچی ساتویں تاریخ تک نامہ و پیام کی منزلیں طے ہوئیں۔ آٹھویں کی شب سے جنگ ناگزیر ہوگئی اور دشمنانِ اہل بیت کی فوج نے فرات پر پہرے بٹھا دیئے اور مظلوموں پر پانی بند کر دیا گیا۔ گرمی کے اس شدید موسم اور کربلا کے ریگزار میں بچوں، بوڑھوں، عورتوں اور جوانوں کی حالت غیر ہونے لگی۔ ایسے میں دشمن اور بھی شر پر کمربستہ ہوئے۔ حضرت امام نے جناب عباس علمدار کو بھیجا کہ حالات کا جائزہ لیں۔ آپ نے کفار کے لشکر سے اس طرح خطاب کیا ؎

یہ سن کے گیا شیر قریبِ صفِ کفار فرمایا کہ اے قوم جفاکار و ستمگار
واجب ہے ادب جنگ میں بہتر نہیں اصرار شبیر ہیں اک رات کی مہلت کے طلبگار
ہم جنگ کو موجود ہیں جلدی تمہیں کیا ہے
بس خیر وہ کل ہوگا جو منظورِ خدا ہے

اس پر شمر نے جواب دیا ؎

لشکر سے یہ تب کہنے لگا شمر ستم گار　　کہہ دو کہ نہیں ملنے کی مہلت تمھیں زنہار
جھنجھلا کے یہ بولے کئی، اس فوج کے سردار　　دیتے ہیں جو کافر بھی ہو مہلت کا طلب گار
کچھ شرم نہیں تجھ کو یہ کیا بے ادبی ہے
شبیر تو فرزند رسولِ عربی ہے

اس طرح یہ طے ہوا کہ آج مہلت دی جائے کل صبح اللہ کے معصوم مظلوم اور بے گناہ بندوں کے اس چھوٹے سے لشکر کو تہ تیغ کر دیا جائے گا۔ حضرت عباس نے بارگاہِ امام میں حاضر ہو کر یہ خبر دی ؎

بھاگا وہ، پھرے ہونٹ چباتے ہوئے عباسؑ　　خیمے میں گئے ساتھ لئے سب کو بصد یاس
کی عرض یہ جا کر پسر فاطمہ کے پاس　　طے ہو گیا وہ امر کبھی جس کی نہ تھی آس
مہلت بھی ملی رُخ بھی پھرا اہل جفا کا
رو کر شہ والا نے کہا شکر خدا کا

اس طرح مدینے سے کربلا تک کا سفر طے ہوا اب درمیان میں وہ رات تھی جس کی صبح وہ قیامت خیز نظارے پیش کرنے والی تھی انسان پر انسان کے ظلم کی انتہا اور گمراہی اور جور و استبداد کے سیاہ ترین کارموں کے طور سے دنیا کی تاریخ میں سیاہ ترین باب بن کر اس کے ماتھے پر کلنک کا ٹیکہ بنے رہیں گے۔

سندھی شاعری میں ذکرِ حسینؑ

کریم بخش خالد

پہلی صدی ہجری میں تاریخ اسلام کا ایک ایسا دلگداز سانحہ رونما ہوا جس نے ملتِ اسلامیہ میں باہمی رنج و نزاع کا ایک ایسا فتنہ کھڑا کیا جس کے سبب آج تک عالمِ اسلام کے ایک ارب سے زائد انسانوں کا شیرازہ منتشر ہے۔ نیز حق و باطل کے مابین اس تصادم سے مسلمانوں کو جو سبق سیکھنا چاہئے تھا۔ وہ تو پوشیدہ رہا البتہ دشمنانِ اسلام کی سازشوں اور حیلہ جوئیوں کے سبب تمام اُمت بعید از کار بحثوں میں اُلجھ کر رہ گئی۔

یہ روح فرسا واقعہ میدان کربلا میں حق و انصاف کی وہ جنگ تھی جس میں حق کا عشق زندگی کی محبتوں پر غالب آگیا اور خدا کے ایک برگزیدہ بندے نے ایسا سجدہ کیا جس کی وجہ سے نہ فقط وہ عالی مرتبت امام بلند ترین رفعتوں پر پہنچکر زندۂ جاوید ہوگیا بلکہ رہتی دنیا تک کے لئے ایک عظیم و بے مثال کردار چھوڑ گیا۔

حضرت امام حسینؑ حق و صداقت کا پیکر جلیل تھے، نیز خاندان نبوت کے رتبۂ رفیع کے امین تھے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا اسوۂ حسنہ آپ کو نہایت عزیز تھا اور یہی وجہ تھی کہ آپ نے باطل کی اطاعت نہ کی اور حق کی سربلندی کے لئے عظیم قربانی دی جس کی وجہ سے اسلام زندہ ہے اور جب تک یہ زمین و آسمان قائم ہیں تاریخ انسانی کے اوراق اس فکری جہاد کے امین و شاہد رہیں گے اور خونِ حسین کی سُرخی انھیں ابد تک تاباں و فروزاں رکھیگی۔

اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے کہ "اللہ تعالیٰ تمھیں آزمائشوں میں ڈالے گا اور حالتِ خوف و ہراس، بھوک اور پیاس، مال و جان کے نقصان اور اولاد و اقارب کی ہلاکت میں مبتلا کر کے تمھارے صبر و استقامت کو آزمائے گا۔ پس اللہ کی طرف سے بشارت ہے ان کے لئے جن کے ثبات و استقامت کا یہ حال ہے کہ جب مصائب میں مبتلا ہوتے ہیں تو اپنے تمام معاملات کو یہ

کہہ کر اللہ کے سپرد کر دیتے ہیں کہ

اِنَّا لِلّٰہِ وَاِنَّا اِلَیْہِ رَاجِعُوْنَ ط

امام عالی مقام نے بھی اپنے تمام معاملات اللہ کے سپرد کر دیئے تھے۔ مولانا ابوالکلام آزاد مظلومِ کربلا کے اسوۂ حسنہ کا ذکر کرتے ہوئے فرماتے ہیں کہ "مظلومِ کربلا کے سامنے یہ تمام مراحل ایک ایک کر کے موجود تھے وہ ان تمام مصائب سے ایک لمحہ کے اندر نجات پا کر آرام و راحت اور شوکت و عظمت حاصل کر سکتے تھے اگر ظالم حکومت کی وفاداری و اطاعت کا عہد کر لیتے اور حق و صداقت سے روگردانی کے لئے مصلحتِ وقت کی تاویل پر عمل کرتے لیکن انھوں نے خدا کی مرضی کو اپنے نفس کی مرضی پر ترجیح دی اور حق کا عشق زندگی اور زندگی کی محبتوں پر غالب آگیا۔ حسینؑ نے اپنا سر دے دیا لیکن اطاعت و وفاداری کا ہاتھ نہ دیا اس لئے جب اسوۂ ابراہیمی کے زندہ کرنے کا وقت آگیا تو خاندانِ نبوت کے زن و مرد بال بچے غرض ہر فرد نے اس میں حصہ لیا اور جن قربانیوں کے پاک خون سے زمین کی آغوش اب تک خالی تھی اُن سے کربلا کا میدان رنگین ہو گیا۔"

اس معرکۂ حق و باطل سے کئی رزمیہ داستانوں نے جنم لیا اور غم و یاس کی بہت سی کہانیاں عالمِ وجود میں آئیں۔ دنیا کی ہر زبان میں رزمیہ شاعری کی مثالیں موجود ہیں کیونکہ یہ قوم کی بیداری اور جوشِ عمل کے استقرار کے لئے ضروری ہیں لیکن داستانِ حسینؑ کو دنیائے ادب میں ایک اہم اور انوکھا مقام حاصل ہے۔

برصغیر میں رزمیہ شاعری میں جب واقعۂ کربلا کی منظر کشی کی گئی تو میدانِ کارزار کی جزئیات کو اور امام عالی مقام کی معصومیت، مظلومیت اور جذبۂ جہاد کو زیادہ اُجاگر کیا گیا کیونکہ اس قسم کی شاعری سے "مرثیہ" کی بنیاد پڑی جو ایک باقاعدہ صنفِ شاعری کی حیثیت سے تاریخِ ادب میں اپنا مقام رکھتی ہے۔

آج کی صحبت میں مجھے سندھ کے تین قادر الکلام شعراء سے متعلق ذکرِ حسینؑ کے حوالے سے بات کرنی ہے۔ یہ محترم بزرگ شعراء غلام محمد شاہ 'گدا' (۱۸۲۴ء - ۱۹۰۵ء) ہز ہائی نیس میر عبدالحسین 'سانگی' (۱۸۵۱ء - ۱۹۲۴ء) اور شمس العلماء میرزا قلیچ بیگ (۱۸۵۳ء - ۱۹۲۹ء)

ہیں جو انیسویں صدی عیسوی کے جدید سندھی شاعری کے نمائندہ شعرا ہیں انھوں نے شاعری کی مختلف اصناف میں طبع آزمائی کی اور سندھی کے علاوہ اردو فارسی میں بھی اپنی قادرالکلامی کے جوہر دکھائے ۔

گدا، اپنے زمانے کے ایک زبردست عالم اور ممتاز شعراء کے اُستاد تھے، ہزہائی نیس میر سانگی کو انگریزی اور بنگالی زبانوں پر زبردست دسترس حاصل تھی ۔ میرزا قلیچ بیگ ، گدا اور سانگی کے ہمعصر اور بہت سی خوبیوں کے مالک تھے ۔ وہ بیک وقت ناول نگار، مترجم، شاعر، عالم، ادیب اور بلند پایہ انشاء پرداز تھے ۔

سندھی ادب کی تاریخ کے مطالعے سے معلوم ہوتا ہے کہ تالپور امیرانِ سندھ کے عہدِ حکومت میں سرکاری زبان فارسی ہونے کے باوجود سندھی میں بھی موزوں شاعری کا خوب چرچا رہا۔ غزل گوئی کا زمانہ بھی اسی ادبی ماحول کا خوشہ چیں ہے۔ سندھی شاعری میں اس عظیم انقلاب کی وجہ سے بہت سے شاعروں کے اسلوبِ بیان پر فارسی شاعری کا رنگ نمایاں نظر آتا ہے ۔ علاوہ ازیں فارسی محاورات تشبیہات، استعاروں اور نازک و نادر نکتوں کے استعمال کی وجہ سے سندھی زبان میں رنگینی اور جاذبیت پیدا ہوئی گدا نے اس ضمن میں بڑا نام پایا ۔ ان کے مقابلے میں سانگی نے فارسیت سے بغاوت کی اور سندھی محاورے اور استعارے استعمال کئے جس کی وجہ سے ان کی شاعری میں (DICTION) زیادہ ہے ۔ میرزا قلیچ نے اپنے دونوں ہمعصروں کے مقابلے میں سندھی زبان کی زیادہ خدمت کی اور اس کے دامن کو وسیع اور مالا مال کیا ۔

یہ تینوں بزرگ شاعر سندھی کے علاوہ اردو اور فارسی زبانوں پر بھی قدرت رکھتے تھے اور انھوں نے دوسرے موضوعات کے ساتھ ساتھ 'حبِ اہلِ بیت' کو بھی موضوعِ سخن بنایا، کیونکہ یہ اسلامی تعلیمات کا ایک حصہ ہے ۔ اور ہماری تہذیب و تمدن کی روایات میں سے ہے ۔

سندھی میں مغلیہ اقتدار سے پہلے اور بعد کے زمانہ میں کبھی بھی شیعہ سنی تنازعات پیدا نہیں ہوئے ۔ یہانتک کہ تالپور خاندان اہلِ تشیع تھے ۔ مگر ان کے زمانے میں کسی فرقے کے ساتھ کوئی زیادتی نہیں ہوئی۔ سندھ میں باقاعدہ سرکاری سرپرستی میں عزاداری کا رواج میر فتح علی خان تالپور (م ۔ ۱۲۱۷ھ) کے عہد سے شروع ہوا اور سید ثابت علی شاہ (م ۔ ۱۲۲۵ھ)

نے مرثیہ ومنقبت پڑھنے کی بنا ڈالی ۔ میر نصیر خاں نے عَلم لگانے کا رواج ڈالا اور میر کرم علی خاں (م ۔ ۱۲۴۴ھ) نے اپنے دربار میں ملکی و غیر ملکی عالم، فاضل اور شعرا کو جمع کیا ۔

شروع میں سال بہ سال مجالس میں 'روضۃ الشہدا، مسکین اور محزون کے اردو مرثیوں کے سندھی منظوم تراجم پڑھے جاتے تھے لیکن سید ثابت علی شاہ نے سندھی مرثیہ ومنقبت میں وہ کمال حاصل کیا کہ ان کے مرثیوں کو سننے کے بعد بہت سے دوسرے شعراء نے بھی سندھی میں مرثیے کہے ۔ ان باکمال مرثیہ گو شعراء میں سید عظیم الدین ٹھٹوی (م ۔ ۱۲۲۹ھ) آخوند محمد بچل ساکن مٹیاری (ضلع حیدرآباد) میر نصیر خاں والیٔ حیدرآباد ۔ سید غلام علی شاہ مائل ٹھٹوی ، مرزا مراد علی بیگ ۔ مرزا فتح علی بیگ ، آخوند محمد عالم خیرپوری اور مرزا بڈھل بیگ قابلِ ذکر ہیں ۔

سید ثابت علی شاہ سے قبل شاہ عبداللطیف بھٹائی ۔ مخدوم عبداللہ نرئے والے ۔ سید خیر شاہ پردیسی، چنن فقیر، سچل سرمست اور مخدوم عبدالرؤف بھٹی ہالائی کے کام میں بھی حبِ اہلِ بیت اور قضیۂ کربلا کا ذکر ملتا ہے ۔ گدا ، سانگی ، اور قلیچ بیگ محض مرثیہ گو شعراء نہ تھے تاہم امام عالی مقام کی سیرت، کردار اور کربلا کے واقعہ سے متعلق ان کی شاعری میں کافی مواد مل جاتا ہے ۔

'گدا' اہلِ بیت عظام اور آئمہ علیہم السلام سے اپنی عقیدت اور محبت کا اظہار کرتے ہوئے کہتے ہیں کہ اے مومنو! اگر محمد صلی اللہ علیہ وسلم کے سچے امتی ہو تو آپ پر ان کی آل کا ادب لازم ہے۔

اي مومنو، جي آهيو محمدؐ جا اُمتي

لازم ادب اوهان تي تيوُن جي آل جو

آگے چل کر گدا کہتے ہیں کہ روزِ محشر شبر و شبیر مجھے رستگار کریں گے

روزِ محشر جي شبر و شبير

شل ڪندا مونکي رستگار بيئي!

دیارِ کربلا کی زیارت کرنے اور غبارِ کربلا کو آنکھوں کا سرمہ بنانے کی تمنا کرتے ہوئے ، گدا کہتے ہیں کہ دشتِ کربلا رشاہ ، کے مدفن کی وجہ سے گلشنِ فردوس بن گیا ہے ۔

روضهٔ شاهِ شهيدان غيرتِ قصرِ بهشت
ڪوثر و تسنيم آهي آبشارِ ڪربلا
سيد الشهدا جو غم جنهن کی نہ آهي نيش زن
تنهن نصيب ان کي هميشه ذهو مارِ ڪربلا

دوسری جگہ گدا فرماتے ہیں کہ اے خدا کے بے نظیر امیر آپ کے لئے خلق خدا غم و محن کے جذبات سے بے قابو ہے اور فرشتے خون کے آنسو بہا رہے ہیں اور حوریں ننگے سر سینہ کوبی کر رہی ہیں ہم صبح و شام آپ کے غم میں خون بہاتے رہیں گے ؎

تون ٿئي خدا جو امير، ڪونہ ڪو تنهنجو نظير
آءُ تنهنجو خادم و فقير، تو تي صلوٰة و سلام
تو لئي مَلَڪ رت رُئن، حورون متو ءُ منهن پٽن،
خلق سڀئي غم و محن، تو تي صلوٰة و سلام
تنهنجو آءُ غم ڪڻن لکان، طاقت مون ۾ ڪٿان
دائم تو لئي سڪان، تو تي صلوٰة و سلام

میر عبدالحسین سانگی نے حضرت قاسم ابن حسنؑ کا مرثیہ لکھا ہے اور حق یہ ہے کہ جس طرح سانگی نے آبدیدہ ہو کر یہ مرثیہ لکھا اسی طرح اس کے سننے کے بعد آنسوؤں کا بحرِ بیکراں جاری ہو جاتا ہے۔ ملاحظہ ہو ؎

قاسم ابن حسن تيو عازم دشت ونما
تي سپر دوش مبارڪ تي عجائب خوشنما
هئي ڪمر تي زيب ور شمشير بران بي بها
جنهن ذُو تي تنهن تي چيو آهي هي حسن المجتبيٰ
نوڪ نيزي جي تي چمڪي جنهن ڪان هي تيو تي گمان
مياڻ جي سوراخ مان آهي ڪڍي اُنهي زبان

قاسمِ نوشه جي گھوڙي جو ڪريان ٿو بيان
پيرڙ رتيءَ ڪان مٿي ھئا رُخ ھو سُوئي آسمان
ڏند ڪرتيئن جي پري ڪان تي ڏٺيئن ٿو بدگمان
تي ٿيئين ھنڪار جيڪو اسپ ات ٿيو تي عيان
شوخ چشمن سان ھر ھر تي ڏنائين چوطرف
تان پرينديءَ ھن صفن مان ڪھڙي صف ٿيندي تلف

تلوار اور گھوڑے کے ذکر کے بعد، حضرت قاسم کی روانگی کا منظر نہایت رنج و ملال کا ماحول پیش کرتا ہے کیونکہ رات کو ان کی شادی ہوتی ہے اور صبح کو مقتل کی جانب روانگی۔ شادی کے بعد تو ہر کوئی دولہا شاد ماں ہوتا ہے لیکن حضرت قاسم سہروں کے ساتھ میدان کارزار میں سر دینے کے لئے جا رہے ہیں۔ اہلِ حرم سر پیٹ رہے ہیں اور دلہن براتیوں کے ساتھ آہ و بکا کر رہی ہے۔

جب حضرت قاسم میدان میں پہنچے تو چوطرف کھلبلی مچ گئی۔ فوج کا برا حال تھا اور کوفی و شامی دہشت زدہ ہو گئے تھے کیونکہ حیدر کرار کے پوتے کا جلال تھا جس کی وجہ سے سب یہی سمجھتے تھے کہ نیام سے جیسے ہی تیغ برق سوزاں نکلے گی تو یہ پہلوان میدان صاف کر دے گا۔ بہر نوع ازرق شامی حضرت قاسم پر حملہ آور ہوا لیکن حضرت قاسم نے اسے بھی داصل جہنم کیا۔ اس کے بعد چوطرف سے اہلِ شر نے دھاوا بول دیا جس کے نتیجے میں حضرت قاسم تیغ زنی اور صف شکنی کے جوہر دکھاتے ہوئے راہی جادۂ شہادت ہو گئے۔

ھن تڏ ڪنجي حملو آور ٿيا چوطرف ڪان اھل شر
ڪنھن ھنيو نيزو تي، ڪنھن شمشير ڪن تير و تبر
تي ھزارن سان وڙھيو بيباڪ حيدر جو جگر
پر ڦري چوطرف آيا تي گھٽا بيداد گر
زخم ڪاري جڏھن لڳا فرمائين تڏ شڪرِ خدا
منھنجو سر ٿيو شاھ دين جي آھي قدمن تان فدا!

جب حضرت قاسم کی لاش مبارک خیمہ گاہ میں لائی گئی تو امام عالی مقام نے کمالِ ضبط و

صبر سے "حکمِ حق کے سامنے سرِ تسلیم و رضا خم کر دیا۔ یہ منظر سانگی کی زبان سے سنیئے ؎

ھو اچان ماتم متل ڦُٽي خيمگه ۾ پٽ گهٽي
لاش قاسم گهوٽ جي رڻ مان اُتي آيا ڪٽي
شاه دين فرمايو بهتر آهي جا حق کي وڻي
سر ڏيان ها پر نه ڏيان ها تنهنجي پيرن جي پٽي
مارياهن دشتِ پُر آفت ۾ سيئي حيدر جا لال
پر ڪريان ڇا ؟ حُڪم جو آهي تا وقت زوال

پھر وہ ساعت آئی جب اُمّتِ مسلمہ کے لئے حضرت امام حسین کو بارگاہِ ایزدی میں اپنی قربانی پیش کرنا تھی۔ اسلام کی زندگی کے لئے قتلِ حسینؑ ہونا تھا اور باطل کو زک پہچانا ضروری تھا تاکہ "حق" اپنی تابناکی برقرار رکھ سکے۔ رہتی دنیا تک کربلا کا بیداد یادگار رہے گا کیونکہ اسی مقتل میں مرتضیٰ کے سب نورِ عین قتل ہوئے۔

بقول "سانگی" ؎

پر ٿيو شاهِ دين راهِ حق ۾ ڪيو وڃي سر کي نثار
عترتِ اطهار کي قيدي ڪري ديا اهلِ نار
جو رسول الله جو نائب تنهن جي هت ۾ هٿي مهار
جيسين دنيا هوندي هي بيداد رهندا يادگار
ڪربلا ۾ قتل ٿيا سڀ مرتضيٰ جا نورِ عين
تن جا جي قاتل انهن تي لعن ڪر عبدالحسين

مرزا قلیچ بیگ کے مرثیوں میں تلوار کی تعریف جنگ کا جوش و خروش اور رزم آرائی کی بہت سی مثالیں ملتی ہیں۔ لڑائی کا منظر ملاحظہ فرمائیے کہ کس طرح امام عالی مقام تن تنہا میدانِ کارزار میں آتے ہیں۔ دریا کی موجوں کی طرح فوجیں نقل و حرکت کرتی ہیں۔ تلواریں علم ہو جاتی ہیں اور رن میں ڈھالوں کے کالے بادل چھا جاتے ہیں۔ قلیچ فرماتے ہیں ؎

دريا جي موجن جان چڙهي فوج يڪبار
۽ تيغون عَلم ٿي ويون درهم صف ڪفار

ڍالن جا تيا ڪارا ڪڪرڙ ۾ نمودار
بدلي جا هوا، مينهن جان تيرن جي ٿي وسڪار
ويو شيرگهري تيغ بڪف اهلِ جفا ۾
چمڪڻ لڳي وچ اُن گهڙيءَ مقتل جي هوا ۾

تن تنها شهِ دين اُت ٿي هزارن سان وڙهيو
ري سپر نيزه گذارن جي قطارن سان وڙهيو
صورتِ شيرِ خدا، ظلم شعارن سان وڙهيو
اسد الله جان ڪل خلق تي او غالب هو
چو ته هو تيو جان علي ابن ابو طالب هو

شہادتِ حسینؑ کے بعد اہلِ بیت رسول پر کیا گزری قلیچ نے اس منظر کو بیان کرتے ہوئے کہا ہے ؎

دشت مان آئي ٿي زهرا جي صدا هاءِ حُسين
منهنجا بيڪس، منهنجا بي پر، منهنجا پٽ واءِ حُسين
چيو پردي مان ٿي زينب مران تولاءِ حُسين
اسين پٽ رڻ ۾ توجنت ۾ ڪئي جاءِ حُسين

برصغیر میں جہاں اُردو میں میر انیسؔ و مرزا دبیرؔ میدانِ مرثیہ کے سپہ سالار کہلائے اور پنجابی میں پیر محمد کاسبی اور حامد شاہ عباسی شہسوارانِ مرثیہ گردانے گئے، اسی طرح سندھی ادب میں حضرت ثابت علی شاہ سیوہانی نے سندھی شاعری کو اعلیٰ مقام دیا۔ اور حقیقت یہ ہے کہ پاکستان کی علاقائی زبانوں میں سب سے زیادہ مرثیے سندھی میں لکھے گئے اور اہلِ بیتِ رسول سے محبت وعقیدت اور سانحۂ کربلا کے رنج وملال کا یہ سلسلہ تین سو سال قبل کی شاعری سے ملتا ہے۔ سندھ کے بہت سے شعراء کے کلام میں جنہیں مرثیہ گو شاعر تو نہیں کہا جاسکتا، ایسے جوہر آبدار بھی ملتے ہیں جو انیسویں صدی عیسوی کی سندھی شاعری میں ذکرِ حسینؑ کے موضوع پر سخن آرائی اور سخن سنجی کی گواہی دیتے ہیں۔

جوش ملیح آبادی

○

موت، صحرا، دشت، ریگستان، بن، بیہڑ، خراب
بے خودی، وحشت، شقاوت، قاہری، دہشت، عذاب
ایک حسرت خیز غفلت ایک عبرت ناک خواب
خوف از خود رفتگی، بیگانگی، غیبت، حجاب
آستیں اُلٹے ہوئے تیغِ دو دم تولے ہوئے
ایک ڈائن زندگی کی سمت منہ کھولے ہوئے

○

نامِ زشتِ موت سے سینوں میں اٹھتا ہے دھواں
فرقِ ہستی پر کڑک اٹھتی ہے دہشت کی کماں
دل پہ رکھ دیتا ہے خوفِ مرگ وہ بارِ گراں
بولنے لگتی ہیں جس سے زندگی کی ہڈیاں!
کوئی نرم آواز کوئی داستاں بھاتی نہیں
موت یاد آجائے تو راتوں کو نیند آتی نہیں

○

لیکن اس کے باوجود اے محرمانِ این و آں
سخت حیراں ہوں کہ تھا وہ کون دانائے زماں
موت کو جس نے دیا نامِ حیاتِ جاوداں
اس قدر پُر ہول بیہڑ کو بنایا گلستاں
زہر کو کس نے حریفِ آبِ حیواں کر دیا
اس آپی تلوار کو کس نے رگِ جاں کر دیا

○

نوعِ انساں کو دیا کس فلسفی نے یہ پیام
مردِ غازی کا کفن ہے خلعتِ عمرِ دوام
نصب کس نے کر دیئے مقتل میں حوروں کے خیام
جانتے ہو اس دبیرِ ذہنِ انسانی کا نام
جو انوکھی فکر تھا جو اک نیا پیغام تھا
اس دبیرِ نکتہ پرور کا محمدؐ نام تھا

○

اے محمدؐ اے سوارِ توسنِ وقتِ رواں
اے محمدؐ اے طبیبِ فطرت و نبّاضِ جاں
اے محمدؐ اے فقیہہِ نفس و نقّادِ جہاں
موت کو تو نے وہ بخشی آب و تابِ جاوداں
زندگانی کے پجاری موت پر مرنے لگے
لوگ پیغامِ اجل کی آرزو کرنے لگے

○

خلق کو تو نے تمنائے شہادت بخش دی
اس تمنائے شہادت نے شجاعت بخش دی
پھر شجاعت نے بھبکنے کی حرارت بخش دی
اس حرارت نے گداؤں کو حکومت بخش دی
اس قدر عجلت سے تو روئے زمیں پر چھا گیا
مدّعی چکرا گئے تاریخ کو غش آ گیا

○

آتشِ سوزاں کو تو نے آبِ زم زم کردیا
وحشیوں کو حاملِ تہذیبِ محکم کردیا
خاک کو نسریں بنایا جام کو جم کردیا
سُرخ شعلوں کو نچوڑا موجۂ نم کردیا
کشتیاں چلوائیں طوفاں سے تیرے فرمان نے
موت بوئی زندگی کاٹی تیرے قرآن نے

○

یہ تصور موت کا جیسے ہی سوئے کربلا
وقت دوں پرور کے تاریخی تقاضے سے مڑا
خون میں تیرے گھرانے کے تلاطم آگیا
لشکرِ صبحِ فروزاں شام کی جانب چلا
دفعتاً قصرِ جفا مسمار ہو کر رہ گیا
رُعب شاہی نقش بر دیوار ہو کر رہ گیا

○

اے محمدؐ موت وہ تیرے نواسے کو ملی
آج تک جس سے درخشاں ہے ضمیرِ آدمی
اللہ اللہ روشنی تیرے چراغِ ذہن کی
کربلا کی دھوپ پر چھٹکی ہے اب تک چاندنی
یہ انی پر سر نہیں تیرے انا کا تاج ہے
کربلا تیرے نظامِ فکر کی معراج ہے

○

آشنا بحرِ صداقت کا حُسین ابنِ علی
مدرسہ درسِ شہادت کا حُسین ابنِ علی
معجزہ فکری نجابت کا حُسین ابنِ علی
حوصلہ تیری نبوت کا حُسین ابنِ علی
جس نے بجھنے دی نہ شمعِ آدمیت وہ حُسین
سانس جس کے دم سے لیتی ہے مشیت وہ حسین

○

طرۂ طرفِ کلاہِ عزم و ہمت ہے حُسین
سورۂ اخلاص و قرآنِ صداقت ہے حُسین
منبرِ تصدیق و تکمیلِ رسالت ہے حُسین
پشتِ ذوقِ مرگ پر مہرِ نبوت ہے حُسین
اے مرے پروردگارِ آدمیت السلام
السلام اے داورِ یومِ شہادت السلام

فیض احمد فیضؔ

رات آئی ہے شبیرؑ پہ یلغارِ بلا ہے　　ساتھی نہ کوئی یار نہ غمخوار رہا ہے
مونس ہے تو اک درد کی گھنگھور گھٹا ہے　　مشفق ہے تو اک دل کے دھڑکنے کی صدا ہے
تنہائی کی، غربت کی، پریشانی کی شب ہے
یہ خانۂ شبیرؑ کی ویرانی کی شب ہے

دشمن کی سپہ خواب میں مدہوش پڑی تھی　　پل بھر کو کسی کی نہ ادھر آنکھ لگی تھی
ہر ایک گھڑی آج قیامت کی گھڑی تھی　　یہ رات بہت آلِ محمدؐ پہ کڑی تھی
رہ رہ کے بکا اہلِ حرم کرتے تھے ایسے
تھم تھم کے دیا آخرِ شب جلتا ہے جیسے

اک گوشے میں ان سوختہ سامانوں کے سالار　　ان خاک بسر خانماں ویرانوں کے سردار
تشنہ لب و درماندہ و مجبور و دل افگار　　اس شان سے بیٹھے تھے شہِ لشکرِ احرار
مسند تھی نہ خلعت تھی نہ خدام کھڑے تھے
ہاں تن پہ جدھر دیکھئے سو زخم سجے تھے

کچھ خوف تھا چہرے پہ نہ تشویش ذرا تھی　　ہر ایک ادا مظہرِ تسلیم و رضا تھی
ہر ایک نگہ شاہدِ اقرارِ وفا تھی　　ہر جنبشِ لب منکرِ دستورِ جفا تھی
پہلے تو بہت پیار سے ہر فرد کو دیکھا
پھر نام خدا کا لیا اور یوں ہوئے گویا

الحمد قریب آیا غمِ عشق کا ساحل　　الحمد کہ اب صبحِ شہادت ہوئی نازل
بازی ہے بہت سخت میانِ حق و باطل　　وہ ظلم میں کامل ہیں تو ہم صبر میں کامل
بازی ہوئی انجام مبارک ہو عزیزو
باطل ہوا ناکام مبارک ہو عزیزو

پھر صبح کی لو آئی رُخِ پاک پہ چمکی　　اور ایک کرن مقتلِ خوںناک پہ چمکی
نیزے کی انی تھی خس و خاشاک پہ چمکی　　شمشیر برہنہ تھی کہ افلاک پہ چمکی
دم بھر کے لئے آئینہ رو ہو گیا صحرا
خورشید جو اُبھرا تو لہو ہو گیا صحرا

پر باندھے ہوئے حملے کو آئی صفِ اعدا　　تھا سامنے اک بندۂ حق یکہ و تنہا
ہر چند کہ ہر اک تھا اُدھر خون کا پیاسا　　یہ رعب کا عالم کہ کوئی پہل نہ کرتا
کی آنے میں تاخیر جو لیلائے قضا نے
خطبہ کیا ارشاد امامِ شہدا نے

فرمایا کہ کیوں درپئے آزار ہو لوگو　　حق والوں سے کیوں برسرِ پیکار ہو لوگو

واللہ کہ مجرم ہو، گنہگار ہو لوگو معلوم ہے کچھ کس کے طرفدار ہو لوگو
کیوں آپ کے آقاؤں میں اور ہم میں ٹھنی ہے
معلوم ہے کس واسطے اس جاں پہ بنی ہے

سطوت نہ حکومت نہ حشم چاہیے ہم کو اورنگ نہ افسر نہ علم چاہیے ہم کو
زر چاہیے نے مال و درم چاہیے ہم کو جو چیز بھی فانی ہے وہ کم چاہیے ہم کو
سرداری کی خواہش ہے نہ شاہی کی ہوس ہے
اک حرفِ یقیں دولتِ ایماں ہمیں بس ہے

طالب ہیں اگر ہم تو فقط حق کے طلبگار باطل کے مقابل ہیں صداقت کے پرستار
انصاف کے نیکی کے مروّت کے طرفدار ظالم کے مخالف ہیں تو بیکس کے مددگار
جو ظلم پہ لعنت نہ کرے آپ لعیں ہے
جو جبر کا منکر نہیں وہ منکرِ دیں ہے

تا حشر زمانہ تمھیں مکّار کہے گا تم عہد شکن ہو تمھیں غدّار کہے گا
جو صاحبِ دل ہے ہمیں ابرار کہے گا جو بندۂ حُر ہے ہمیں احرار کہے گا
نام اونچا زمانے میں ہر انداز رہے گا
نیزے پہ بھی سر اپنا سرافراز رہے گا

کر ختم سخن محوِ دعا ہو گئے شبیّر پھر نعرہ زناں محوِ دغا ہو گئے شبیّر
قربانِ رہِ صدق و صفا ہو گئے شبیّر خیموں میں تھا کہرام جدا ہو گئے شبیّر
مرکب پہ تنِ پاک تھا اور خاک پہ سر تھا
اس خاک تلے جنّتِ فردوس کا در تھا

امید فاضلی

اے زہے نسلِ علیؑ علم کا در کھلتا ہے
مصحفِ نور سرِ رحلِ نظر کھلتا ہے
لب جو کھولوں تو یہاں عجزِ ہنر کھلتا ہے
منزل آتی ہے تو سامانِ سفر کھلتا ہے

علم کے در سے اگر میری سفارش ہو جائے
کشتِ تخئیل پہ الفاظ کی بارش ہو جائے

علم کیا ہے شہِ لولاک لما سے پوچھو
علم کے در پہ چلو شیرِ خدا سے پوچھو
عصمتِ علم کو زہرا کی ردا سے پوچھو
اس کا ایثار دلِ آلِ عبا سے پوچھو

علم شبّر کا چلن اسوۂ شبّیری ہے
جو قدم بھی یہ اٹھالیں وہی تعمیری ہے

علم ادراک کا مصحف ہے، خرد کا منشور
خود شناسی کا اسی راہ میں ہوتا ہے ظہور
علم ہے سطحِ جبلّت سے بلندی کا شعور
ہاتھ باندھے ہوئے جبریل ملے اس کے حضور

سرِ بستر ہو تو یہ حق کا ولی ہوتا ہے
کربلا ہو تو حسین ابنِ علی ہوتا ہے

وہ حسینؑ ابنِ علیؑ حق کی وہ روشن قندیل　　راکبِ دوشِ نبیؐ سروِ قدِ باغِ خلیلؑ
دیکھ کر اُس کی طرف جھوم اُٹھے اسمٰعیلؑ　　اُس کا ہر قطرۂ خوں عظمتِ انساں کی دلیل

آدمیّت اسی کردار سے تابندہ ہے
اے اجل دیکھ حسینؑ ابنِ علیؑ زندہ ہے

وہ حسینؑ ابنِ علیؑ بندۂ یکتائے احد　　ہر شہادت کے لئے جس کی شہادت ہے سند
مقتلِ جاں میں اُسے دیکھا تو بولی یہ خرد　　"صبر تلخ است ولیکن برِ شیریں دارد"

آج سجدہ میں یہی درس دیا جائے گا
کس طرح موت کو تسخیر کیا جائے گا

جب اندھیروں نے یہ چاہا کہ نہ اُبھرے خورشید　　رات ڈھلنے کی نہ باقی رہی کوئی اُمّید
ذوقِ ایثارِ براہیم بہ شبیرؑ رسید　　"آسماں بارِ امانت نہ توانست کشید"

سر ہتھیلی پہ رکھے حق کا ولی آپہونچا
کربلا دیکھ حسینؑ ابنِ علیؑ آپہونچا

مطلعِ صبحِ ازل جلوۂ کردارِ حسینؑ　　مقطعِ شامِ ابد سایۂ افکارِ حسینؑ
فاتحِ مرگ و اجل جرأت و ایثارِ حسینؑ　　زندگی آج بھی ہے آئینہ بردارِ حسینؑ

ساقیِ کرب و بلا سب کو سبو دیتا ہے
انتہا یہ ہے کہ خنجر کو لہو دیتا ہے

. . . ★ ★ ★ . . .

○

عارف عبدالمتین

زندگی ہے اپنی رعنائی میں آپ اپنی مثیل
زندگی ہے آپ ہی اپنی اداؤں کی قتیل
زندگی خود کارواں، خود منزلِ ہر کارواں
خود ہی وہ بانگِ درا ہے، خود ہی آوازِ رحیل!

زندگی کو موت کے ہر روپ سے انکار ہے
موت، ہے حالت سکوں کی، زندگی رفتار ہے
ہم اِسی رفتار کو کہتے ہیں اک طوفاں کبھی
ایسا طوفاں موت جس میں کاہِ ہرزہ کار ہے!

ہاں مگر یہ کاہِ ہرزہ کار کچھ حالات میں
کوہِ ہیبت ناک بن جاتا ہے اپنی ذات میں
کوہِ ہیبت ناک جس کی سطوتوں کے ہول سے
عظمتِ طوفاں سمٹ جاتی ہے کچھ قطرات میں!

صورتِ احوال یہ لیکن کبھی دائم نہیں
کوہِ ہیبت ناک کی ہیبت رہی قائم کہیں
کوہِ ہیبت ناک آخر کاہِ ہرزہ کار ہے
اور ہرزہ کار ہر حالت میں ہے تیرہ جبیں

اے امامِ کربلا — اے بحرِ تابندہ جبیں ،
تیری پہنائی ہے اس طوفاں کی وسعت کی امیں ،
جو دھنک دیتی ہے یوں ہر کوہِ ہیبت ناک کو
جیسے وہ اک ناتواں پنبے کی صورت ہو مہیں !

تو بظاہر مٹ گیا ، لیکن کہاں مٹتا ہے تو ،
تو کہ بحرِ بیکراں ہے ، مرجعِ صد آبجو ،
موت کے گرداب میں تیری نمازِ زندگی
اپنے ہی خوں سے ترے بیباک پیکر کا وضو !

یہ وضو اور یہ نمازِ زندگی کس کو نصیب
یوں فنا ہو کر بقا کا کون ہوتا ہے نقیب
تو شہادت کی نہایت پر کھڑا ہے اس طرح
مرگِ لرزاں کو کہاں ہمت کہ ہو تیرے قریب !

خیر کا پرچم فضا میں اس طرح لہرا گیا
شر سے اپنا سر کٹا کر سربلندی پا گیا
آدمیت ہو گی مرہونِ وفا تیری سدا
تو جسے عظمت سے جینے کا ہنر سکھلا گیا

اس ہنر کی پرورش پر ہے اساسِ کائنات
اس ہنر سے ہر قدم پر ہے عیاں نقشِ ثبات
یہ ہنر نورِ ازل ہے جس کی تابش کے طفیل
رنگ میں ڈوبے رہیں گے تا ابد یہ شش جہات !

○

وزیری پانی پتی

بالاتر از خیال ہے رفعت حسینؑ کی
معلوم کیا کسی کو حقیقت حسینؑ کی
ہر ایک دل پہ نقش ہے عظمت حسینؑ کی
ہے کارِ بے مثال شہادت حسینؑ کی
اس مردِ حق نگر پہ شہادت کو ناز ہے
ایسا شہید جس پہ نبوت کو ناز ہے

رکھی حق و صداقت و ایثار کی اساس
کھوئے نہ انتہائے مصائب میں بھی حواس
جاں دی بغیرِ خوف و پریشانی و ہراس
جس کو ذرا گراں نہ ہوئی تین دن کی پیاس
لب تشنہ ہی رہا جو کنارِ فرات پر
احساں ہے جس کا موجۂ بحرِ حیات پر

جو اپنے خوں سے کر گئے روشن وہ عرش جاہ
اُس شمعِ پُرضیا کی بدولت خدا گواہ
پُرنور آج بھی ہے محبت کی شاہراہ
کیا سخت امتحان تھا اللہ کی پناہ
سب کچھ نثار برسرِ میدان کر دیا
اصغرِ سا شیر خوار بھی قربان کر دیا

گھبرائے کیا حسینؑ کو طاقت یزید کی محکوم کر سکی نہ حکومت یزید کی
کرتے بھی کیا امام اطاعت یزید کی کی آپ نے قبول نہ بیعت یزید کی
دو دن کے عیش کو نظر انداز کر دیا
غم کی حقیقتوں کو سرافراز کر دیا

وارد ہوئے فرات کے نزدیک جب حضور ہونے لگی تھی بارشِ کیف سرور و سرور
آنے لگی بہار چہکنے لگے طیور پھیلا تھا آمدِ شہِ ذیشان سے جو نور
وہ نور کربلا میں نمایاں ہے آج بھی
ہر ذرّہ آفتابِ درخشاں ہے آج بھی

نجم آفندی

اے کہ قائم ہیں ترے احساسِ غم سے مشرقین
اے حسینِؑ کربلا! اے سارے عالم کے حسینؑ!

جان تو نے راہِ حق میں ہاشمی جاں باز دی
تو نے ہی اسلام کی آواز پر آواز دی

ساری دنیا دیکھتی تھی جب تماشہ دین کا
کفر کے ہاتھوں سے چھینا تو نے لاشہ دین کا

دیکھ کر افسردگی توحید کے پیغام میں
تو نے اپنی روح بھر دی پیکرِ اسلام میں

مصلحِ اعظم! ترا احساں ہے کُل اقوام پر
تو نے اپنا سر دیا انسانیت کے نام پر

آج ہے اقطاعِ عالم پر جہانبانی تری
اب پرستش کر رہی ہے نوعِ انسانی تری

خون کے دھاروں سے ایوانِ حکومت ڈھا دیئے
حق کی قرباں گاہ پر کتنے گلے کٹوا دیئے

زورِ باطل کا گھٹایا حق پناہی نے تری
کر دیا دنیا کو سیدھا کج کلاہی نے تری

جرم کہلانے کو سرمایہ پرستی رہ گئی
مٹ گئی قاتل کی ہستی تیری ہستی رہ گئی

زندگی کی دوڑ میں ہم سست گاموں کا سلام
تاجدارِ حریت! تجھ پر غلاموں کا سلام

★

احمد ندیم قاسمی

سر میں ہے نوکِ سناں جسم ہے پیکاں پیکاں
خون ہی خون ہے پھیلا ہوا میداں میداں
کس کی آنکھیں ہیں کہ بجھ کر بھی ہیں مشعل مشعل
کس کا چہرہ ہے کہ کٹ کر بھی ہے رخشاں رخشاں
یہ شہادت ہے اس انساں کی کہ اب حشر تلک
آسمانوں سے صدا آئے گی انساں انساں!
یہ اُسی فخرِ دو عالم کا جگر گوشہ ہے
جس کی رحمت کبھی بٹتی رہی داماں داماں
کیا قیامت ہے کہ کلیوں سے بھی کم سن بچّے
چہرے ماؤں کے تکے جاتے ہیں حیراں حیراں
— جن کو معلوم ہیں اسرارِ پرستارئِ حق
— ان مراحل سے گزر جاتے ہیں آساں آساں

★ ★ ★

○

فارغ بخاری

حسینؑ نوعِ بشر کی ہے آبرو تجھ سے
حدیثِ حرمتِ انساں ہے سرخرو تجھ سے

ملایا خاک میں تو نے ستمگروں کا غرور
یزیدیت کے ارادے ہوئے لہو تجھ سے

بہت بلند ہے تیری جراحتوں کا مقام
صداقتوں کے چمن میں ہے رنگ و بو تجھ سے

ترے لہو کا یہ ادنےٰ سا اک کرشمہ ہے
ہوئی ہے عام شہادت کی آرزو تجھ سے

اُسی طرح ہے وہ تیرے پیام کا جادو
چلی ہے قرنوں کی مہکار کو بہ کُو تجھ سے

وہ باغیانہ خیالات اب بھی زندہ ہیں
ترے گھرانے میں ملتے ہیں ہُو بہُو تجھ سے

کبھی نہ جبر کی قوت سے دب سکا فارغ
ملی ہے ورثہ میں یہ سرکشی کی خُو تجھ سے

★

○

ثروت حسین

نظر سے شامِ غریباں کا وہ سماں نہ گیا
فراخِ دشت سے پھر ایسا کارواں نہ گیا

جھلک اٹھا ہے کنارِ افق سے تا بہ افق
ابد کنار ہوا خون رائیگاں نہ گیا

وہ شب چراغ کہ تیرے لہو سے روشن تھا
شعارِ مہر ہوا تو کہاں کہاں نہ گیا

ہزار شکر کہ وہ ایک لمحۂ اُمید
جہانِ جبر سے بے صوت بے اذاں نہ گیا

ہوائیں تیز تھیں لیکن ہمارے ہاتھوں سے
وہ اک نشان وہ دامانِ خونچکاں نہ گیا

اقبال ساجد

حسینؑ تیرے لئے خواہشوں نے خوں رویا
فضائے شہر تمنا بہت اُداس ہوئی

غبارِ ظلم پہ رنگِ شفق بھڑک اُٹھا
زمیں پہ آگ بگولا گلوں کی باس ہوئی

غموں کو کاشت کیا آنسوؤں کے موسم میں
یہ فصل اب کے بہت دل کے آس پاس ہوئی

وہ پیاس جس کو سمندر سلام کرتے ہیں
ہوئی تو تیرے لبوں سے ہی روشناس ہوئی

جو تُو نے خون سے لکھی حسینؑ وہ تحریر
کتابِ حق و صداقت کا اقتباس ہوئی

کبھی بجھا نہ سکے گی ترے چراغ کی لَو
کہ جمع تیری امانت ہوا کے پاس ہوئی

دُکھوں میں ڈوب گئی دشتِ کربلا کی سحر
ہوائے شام ترے غم میں بدحواس ہوئی

سلیم کوثر

یہ فقط عظمتِ کردار کے ڈھب ہوتے ہیں
فیصلے جنگ کے تلوار سے کب ہوتے ہیں

صرف جرأت پہ ہی موقوف نہیں سچائی
حق کے اظہار کو کچھ نام و نسب ہوتے ہیں

زیست کرنا تو کوئی فتح کا اعزاز نہیں
مرحلے عشق کے تو جان طلب ہوتے ہیں

بارشِ خوں میں مہک اٹھتے ہیں زخموں کے گلاب
دن کے آثار گھنے گیسوئے شب ہوتے ہیں

یہ جو سجدے میں سرِ مقتلِ جاں دیکھتے ہو
لوگو یہ سبطِ شہنشاہِ عرب ہوتے ہیں

دیں کی عظمت کیلئے رفعتِ ایثار کے ساتھ
بیج صحرا میں اجڑنے کے سبب ہوتے ہیں

جھوٹ تعداد میں کتنا ہی زیادہ ہو سلیم
اہلِ حق ہوں تو بہتر بھی غضب ہوتے ہیں

...★...

شہسوارِ کربلا

ابوالاثر حفیظ جالندھری

لباس ہے پھٹا ہوا　　غبار میں اَٹا ہوا
تمام جسمِ نازنیں　　چھدا ہوا کٹا ہوا
یہ کون ذی وقار ہے　　بلا کا شہسوار ہے
کہ ہے ہزاروں قاتلوں کے سامنے ڈٹا ہوا
یہ بالیقیں حسینؑ ہے
نبیؐ کا نورِ عین ہے

یہ جس کی ایک ضرب سے　　کمالِ فنِّ حرب سے
کئی شقی گرے ہوئے　　تڑپ رہے ہیں کرب سے
غضب ہے تیغۂ دوسر　　کہ ایک ایک وار پر!
اٹھی صدائے الاماں، زبانِ شرق و غرب سے
یہ بالیقیں حسینؑ ہے
نبیؐ کا نورِ عین ہے

یہ مردِ حق پرست ہے　　مئے رضا سے مست ہے
کہ جس کے سامنے کوئی　　بلند ہے نہ پست ہے
اُدھر ہزار گھات ہے　　مگر عجیب بات ہے
کہ ایک سے ہزار ہا کا حوصلہ شکست ہے
یہ بالیقیں حسینؑ ہے
نبیؐ کا نورِ عین ہے

عبا بھی تار تار ہے　　یہ جسم بھی فگار ہے
زمیں بھی ہے تپی ہوئی　　فلک بھی شعلہ بار ہے
مگر یہ مردِ تیغ زن،　　یہ صف شکن فلک فگن
کمالِ صبر و تن دہی سے محوِ کارزار ہے
یہ بالیقیں حسینؑ ہے
نبیؐ کا نورِ عین ہے

دلاوری میں فرد ہے　　بڑا ہی شیر مرد ہے
کہ جس کے دبدبے سے　　دشمنوں کا رنگ زرد ہے
حبیبِ مصطفےٰؐ ہے یہ　　مجاہدِ خدا ہے یہ
جبھی تو اس کے روبرو، یہ فوج گرد گرد ہے
یہ بالیقیں حسینؑ ہے
نبیؐ کا نورِ عین ہے

اُدھر سپاہِ شام ہے　　ہزار انتقام ہے
اُدھر ہیں دشمنانِ دیں　　اِدھر فقط امام ہے
مگر عجیب شان ہے　　غضب کی آن بان ہے
کہ جس طرف اٹھی ہے تیغ بس خدا کا نام ہے
یہ بالیقیں حسینؑ ہے
نبیؐ کا نورِ عین ہے

★

مظفر وارثی

حسینؑ سچائی ہے وفا ہے

صراطِ حق الیقین کا راہی احاطۂ خانۂ الٰہی
چراغِ دیوارِ مصطفےٰ ہے حسینؑ سچائی ہے وفا ہے

خدا کے قانون کا خلاصہ رسول کی شرحِ زندگانی
ملوکیت کا غنیم اوّل نظامِ جمہوریت کا بانی
مرید ہیں انقلاب اس کے گناؤں کیا کیا خطاب اس کے
یقین ہے صبر ہے رضا ہے
حسینؑ سچائی ہے وفا ہے

حنائے گیتی ہے خون اس کا سبیلِ کوثر ہے پیاس اُس کی
شفق میں لہرائیں رنگ اس کے ہوائے جنّت میں باس اُس کی
بقا کی وادی میں اس کے ڈیرے وطن غریب الوطن کا میرے
نجف ہے طیبہ ہے کربلا ہے
حسینؑ سچائی ہے وفا ہے

اکھڑتی سانسیں ضخامت دیں کٹا ہوا سر لغاتِ قرآں
بس ایک سجدہ امامِ عالم بس ایک ہچکی سقوطِ ایماں
جدید و تازہ وہ ہر صدی میں کفِ نظامِ محمدی میں
کمان ہے تیغ ہے عصا ہے
حسینؑ سچائی ہے وفا ہے

علم ہیں آنکھوں میں آنسوؤں کے چلے نفس مشکِ غم اٹھائے
خیال، صحرائے شب میں نکلے چراغِ نقشِ قدم اٹھائے
حیات کو اس کے نام کرنا لہو کو اس کے سلام کرنا
خراج ہے عشق ہے دعا ہے
حسینؑ سچائی ہے وفا ہے

جبر کی ریگ ہر اک سمت اُڑی پھرتی تھی

عارف عبدالمتین

آدمیت کا گلستاں کہ جسے روحِ رسالت نے صبا کی صورت
نکہت و رنگ کے اعجاز سے فردوس بنا ڈالا تھا
وقت کی صرصرِ شوریدہ نے اندازِ ملوکانہ سے
اس طرح دیکھتے ہی دیکھتے ویران کیا،
جیسے وہ فصلِ بہاراں سے کسی طور شناسا ہی نہ تھا!

جبر کی ریگ ہر اک سمت اُڑی پھرتی تھی،
دُور تا حدِّ نظر جھوٹ کا صحرا تھا محیط،
دندناتی تھی بگولوں کی طرح سطوتِ شاہی جس میں!

آدمیت کے گلستاں کی یہ ویرانی گراں تھی تجھ پر،
تجھ کو منظور نہیں تھا کہ صبا کا فردوس،
یوں ہلاکت کے جہنم میں بدل کر رہ جائے!
راحتِ روح و بدن کرب میں ڈھل کر رہ جائے!!

تو اُٹھا مطلعِ حرّیت سے،

ابرِ شاداب کے رحمت بھرے اسلوب کے ساتھ
اور سفّاک فضاؤں سے ترا پیکرِ رنگیں اُترا ،
آدمیت کے خزاں دیدہ گلستاں میں لئے اپنے لہو کی برکھا !

تیری برکھا کی ترل رل سے اک افسانہ بنی جبر کی ریگ ،
اک کہانی میں ڈھلا جھوٹ کا پھیلا صحرا۔
اور صحرا کے بگولوں کی حقیقت ہوئی اک خواب کی پرچھائیں سی !

آدمیت کے گلستاں کو ترے خوں سے ملاکتنی ہی پوشیدہ بہاروں کا سُراغ
کھِل اُٹھے اس میں محبت کے گل ولالہ کہیں ،
اور چٹکے کہیں ایثار و وفا کے غنچے ،
سچ کہیں سرو و سمن بن کے نمودار ہوا ،
حق کہیں سنبل و ریحاں سے ہم آثار ہوا ،
ابنِ آدم کو نئے سر سے کسی جنتِ گم گشتہ کا دیدار ہوا !

اے حسینؑ ابن علیؑ تجھ کو، ترے اوجِ شہادت کو سلام !
تری ثروت، تری رفعت، تری عظمت کو سلام !!

فارغ بخاری

سلام تجھ پہ مسلّح بغاوتوں کے امام

حسینؑ میں تجھے خوں کا خراج کیسے دوں
تو رن میں آیا تھا خارا شگاف عزم لئے
ہے بے مثال زمانے میں تیری قربانی

تو وہ دلیر شجاعت بھی تجھ پہ فخر کرے
تو وہ عظیم کہ عظمت کو ناز ہے تجھ پر
تو وہ شہید، شہادت ہے سرخرو تجھ سے

جھکا نہ عزم ترا ظلم کی مشیت پر
رکے نہ تیرے قدم وحشتوں کی آندھی سے
ترے جلال نے ہر مصلحت کو ٹھکرایا

سلام تجھ پہ، حریفانِ آذری کے خدا
سلام تجھ پہ فقیہانِ سرکشی کے رسول
سلام تجھ پہ مسلّح بغاوتوں کے امام

* * * * * *

امامِ عالی

کشور ناہید

تمہارے دم سے امامِ عالی
گلاب کے معجزے بھی صحرا میں ہم نے دیکھے
یہ ہم نے دیکھا
کہ وہ فضائیں بھی نیلگوں ہیں
جہاں کہیں رات ڈھل نہ پائی
یہ ہم نے دیکھا
کہ ریگِ صحرا
ادائے زینبؑ کے غم میں بے حال
نامرادی کے بین کرتی بلک رہی ہے۔
یہ ہم نے دیکھا۔
ہمارے پیاروں کے پیاسے ہونٹوں کی داستاں
اب تلک رقم ہے
ہر ایک موسم کی اُداس لمحوں کو
آگ بن کر جلا رہی ہے
یہ ہم نے دیکھا۔

زمیں کی قسمت میں جتنی زردی تھی
صرفِ صحرائے نجد ہو کر
ہوا کی تحریر بن گئی ہے
یہ ہم نے دیکھا
تمام بچوں کے پھول چہروں کی آب
جب کربلا میں اُجڑی
تو ہمیں موجِ فرات بھی
حدتِ فغاں سے اُبل پڑی تھی
تمہارے دم سے امامِ عالیؑ
حباب کے معجزے بھی صحرا میں ہم نے دیکھے
یہ ہم نے دیکھا
کہ تم نہیں تھے تو ہر نظر میں تمہاری تصویر تھی ہویدا
ہر ایک اوجِ وفا پہ تحریر تھا اُجالوں کا سبز سایہ
یہ ہم نے دیکھا
کہ تم نے پایا حیات و بعدِ حیات
وہ رتبۂ شہادت
کہ نبضِ ہستی
فضا کی دہلیز سے لپٹ کر
بقا کے غم کو ترس رہی ہے
تمہارے دم سے امامِ عالیؑ
گلاب کے معجزے بھی صحرا میں ہم نے دیکھے

حسینؑ

حسن اکبر کمال

استعارہ عظمتِ انساں کا ہے
اور تیرگی سے برسرِ پیکار
روشن تر ستارا ہے حسینؑ

ظلم کا جلتا ہوا سورج
کسی اک فرد پر یا نوعِ انساں پر
قیامت آگ کی مانند برسائے
تو بن جاتا ہے گویا
سائباں نامِ حسینؑ
ایسی بستی میں صداقت کی سپر بن کر
لہو کا پیرہن پہنے
ہمیشہ لوگ باطل کے مقابل آتے رہتے ہیں۔
جہاں رکھتے ہوں دل میں
جزوِ ایماں کی طرح
پیر و جواں، نامِ حسینؑ
حق شناسی کی علامت
حق پرستی اور مثالی استقامت کا نشاں
سرچشمۂ ایثارِ جاں نامِ حسینؑ
خاکِ پائے اہلِ بیت سرورِ کونین، اے ناچیز شاعر
کہاں یہ تنگ داماں لفظ تیرے
اور کہاں نامِ حسینؑ!

داستانِ حرم

رئیس اخمر

میں آج تشنۂ سخن نہیں ہوں
میں آج خود اپنے خونِ خالص میں اپنا مخلص قلم ڈبو کر
زباں سے نادِ علی کو پڑھ کر لبوں سے قرطاس کو لگا کر
ادب سے نام حسینؑ لے کر
میں لکھ رہا ہوں قلم سے اپنے وہ خونچکاں داستاں حرم کی
وہ جس سے تاریخ آدمی کی رنگی ہوئی ہے۔
وہ جس سے رنگین آج انساں کی داستاں ہے۔

وہ جس میں انساں کے خونِ ناحق کی ایک معصوم سی امانت
فلک نے بارِ گراں سمجھ کر
زمیں نے آتش فشاں سمجھ کر
قبول کرنے سے معذرت کی
کہ اس طرح سے
برس سکے گا نہ بوند پانی

نہ کوئی سبزہ ہی اُگ سکے گا۔
لہو وہ جس کو کہ ایک انساں نے آدمی کی بقا کی خاطر
خود اپنے چہرے پہ مل لیا تھا۔
یہ زہر بھی آپ پی لیا تھا
زمیں پہ کربِ گرسنگی تھا
فلک پہ تھی تشنگی بلا کی

میں لکھ رہا ہوں کہ آج نوکِ مژہ پہ رشکِ قمر سجے ہیں
قلم کی تازہ زباں سے پیہم لہو کے قطرے ٹپک رہے ہیں
کہ لکھ رہا ہوں وہ داستانِ وقار و جرأت
وہ خونچکاں داستانِ انساں
وہ ایک انساں
جو پیکرِ عزمِ آہنی تھا
وہ جس نے انسانیت سے خالص وفا کے بدلے
اسی زمیں پر
کنارِ دریا
بس ایک معصوم آبرو پر
خود اپنے بازو کٹا دیئے ہیں

قلم سے تحریر ہو رہی ہے وہ داستانِ لطیف و سادہ
وہ جس میں انسانیت کے حق پہ کمالِ ذوقِ یقیں کی خاطر

جوان انساں نے نرم سینے پہ گرم لوہے کا تیز بھالا بھی سہہ لیا ہے

قلم سے تحریر کر رہا ہوں وہ داستانِ غریب جس میں
ہوئی یوں اک نوجواں کی شادی
عروسِ انسانیت کے سینے کو تختۂ گل بنایا جس نے
نہ بندھ سکا اس کے سر پہ سہرا
مگر ہوا جسم لاکھوں گھوڑوں کی سخت ٹاپوں سے پارہ پارہ

قلم سے اپنے میں لکھ رہا ہوں وہ داستانِ مشیتِ ایزدی کہ جس میں
رہِ فنا میں
قدیم انساں عظیم سوکھے گلے کٹا کر
نشانِ باطل مٹا گئے ہیں
پلا کے آبِ بقا گئے ہیں — پھر اس جہاں کو
میں لکھ رہا ہوں قلم سے اپنے وہ داستانِ غریب و سادہ
کہ جس میں آزاد ہو کے انساں
خود اپنے حق پر گواہ بن کر تمام عالم پہ چھا گیا ہے

قلم سے "رنگین" داستانِ امیرِ برحق میں لکھ رہا ہوں
حسینؑ آئے
لطیف اشارے پہ کبریا کے
زمرّدیں آسماں کے نیچے

لہو نہائی ہوئی زمیں پر
حسینؑ کرتے ہیں جمع اپنے حسین ساتھی
خدا کے پرچم کے زیرِ سایہ
بدن پہ خونیں قبا سجائے
شکم پہ تابِ گرسنگی کے لئے کوئی سنگ بھی نہیں ہے
نہ رُخ پہ اظہارِ تشنگی ہے
حسینؑ کے بے عدیل ساتھی
شہادتوں کے گلاب بن کر چمن میں سوئے
حسینؑ ذی شان و ذی حشم نے
سُرخ مٹی کی کربلا پر
زرد چادر کے سائباں میں
وفا کے ان ناموَر نصیبوں کی سمت دیکھا
عظیم لیکن اداس تنہائیوں میں اپنی
رسیلے لہجے میں گنگنا کر
زبانِ صدق و صفا سے اپنی
ندائے "ہل من" لگا کے پیہم
اکیلے جنگِ عظیم لڑ کر
شہید ہو کر
حیات کا وہ چمن کھلایا
کہ اِک خدائی پکار اٹھی
حسینؑ تو نے

جہانِ انسانیت کو بخشی بہارِ دائم

حسینِؑ اعظم کے ایک دن کی یہ جانفزا جاوداں حکایت
ہر اک زمانے کے ہر ورق پر
حسین کہاوت یہ بن گئی ہے
کہ سر کٹانا، نہ سر جھکانا

حسینؑ کی خونچکاں کہانی
جو چند لفظوں پہ مشتمل ہے۔
حرم کی یہ داستانِ "رنگیں" اگرچہ سادہ ہے
مختصر ہے
مگر یہ پھر بھی عظیم تر ہے

سوچتی ہے کائنات

محسن سوز

آج بھی میدانِ خاک وخون ہوتی یہ زمیں
آج بھی بہتا ہوس کاروں کے ہاتھوں
عدل کی شہ رگ کا خون
آج بھی دریا کے ساحل پر تڑپتے تشنہ لب
آج بھی انسانیت کے دوش پر ہوتا عذابِ تخت وتاج
آج بھی ہوتا سروں پر نفرتوں کا آسماں
آج بھی جمہوریت کا نام لیتا کون سینہ تان کے
آج بھی دنیا میں پھلتی پھولتی فکرِ یزید

وہ ——————
نہ دے جاتا اگر انساں کو جینے کا شعور
جس نے
اپنے اور اپنے دوستوں کے خون سے سینچا چمن انصاف کا،
اخلاص کا، امید کا، احساس کا، ایثار کا
ہاں، وہی اک شخص ——————
جس کے حوصلوں پر آج تک
ناز کرتی ہے حیات
سوچتی ہے کائنات !!!

اندھیرے میں کوئی اُجالا

اقبال ارشد

راستے پُرخطر، منزلیں بے نشاں
بیکراں، بیکراں دائرے خون کے
ہر طرف موت ہی موت بکھری ہوئی
ہر طرف آتش و زہر کے سلسلے
زہر کے سلسلے آگ کی برچھیاں
آگ کی برچھیاں خون میں تر بہ تر
دھوپ کی ندیاں، ریت کی شعلگی
غم کی شمشیر سینے میں پیوست ہے
دل پہ زخموں کا گلشن ہے پھیلا ہوا
آسماں کی فضا سُرخ ہے زرد ہے
جبر کی فوج ہر سمت ہے خیمہ زن
ارضِ کعبہ کی پُرنور دہلیز پر
ظلم کی دھند ہے جہل کی گرد ہے
رہروانِ رہِ امن و تہذیب پر
بند ہے فکر کی حریت کا عمل
ہر قدم پر صعوبت کی دیوار ہے
بادشاہی ہلاکت کا پیغام ہے
آدمی اپنے مرکز سے انجان ہے

قید کی الجھنیں، دار کی سختیاں
طوق و زنجیر تقدیرِ اہلِ نظر
کلفتیں، بندشیں مصلحت کیشیاں
دامِ تحریص ہے دامِ ترغیب ہے
حکم ہے کوئی لب پر نہ لائے گلہ
حاکمِ تخت مختارِ تقدیر ہے
اپنی حد سے فزوں ہے شبِ تیرگی
اِس اندھیرے میں کوئی اُجالا نہیں
"ارضِ کربل" پہ سورج کی پہلی کرن
قافلے کو سفر کی اجازت ملی
کاروانِ وفا راہ پر آگیا
اب اندھیروں کی زنجیر کٹ جائیگی
منظرِ دردِ غم ختم ہو جائے گا
شام کا سلسلہ ٹوٹ جانے کو ہے
روشنی کی علامت ہویدا ہوئی
اِس علامت کا پیغام اظہار ہے
وہ علامت کہ منشورِ اسلام ہے
وہ علامت کہ تفسیرِ قرآن ہے

لفظ اور مفہوم کا ملاپ

رئیس فروغ

بے شمار آوازوں کی ایک آواز
لمحہ بہ لمحہ ساعت بہ ساعت
بلندی پھیلاؤ اور گہرائی کی حدیں عبور کرتی ہوئی آواز
اس روز لفظ اور مفہوم کا ملاپ ہوا تھا
جب بڑے عجیب فیصلے ہوئے
وہ جو روئے زمین پر سب سے محترم تھا
وہ جو کلام کا سورج تھا۔
اور اس کا اپنا ایک نظام تھا
اس نے لفظوں کو مفہوم کی روشنی عطا کی
جب علی اکبر کے سینے پر زخم لگا
تو جمالیاتی الفاظ بامعنی ہوگئے
جب عباس کے بازو پر وار ہوا
تو وفا کا شجرۂ الفاظ معتبر ہوگیا
قاسم کے لہو سے ایثار
اصغر کے خوں سے معصومیت کے مردہ الفاظ کے پیکروں میں زندگی کی حرارت آئی
ہاں وہ لفظوں کو مفہوم دینے کا دن تھا۔

خیمہ کی طرف دیکھو
یہاں وہ ہیں جن کے قدم عالمِ قدس کی بلندیوں پر پڑتے ہیں ۔
یہاں وہ ہیں جن کا تبسم فرشتوں کے پردہ پر پھیلتا ہے ۔
یہاں ایک بہن ہے
جو ایک دربار میں بولے گی
اور اس کی آواز میں وقت بولے گا ۔
وقت جو آتا ہے گزر جاتا ہے
کسی کا انتظار نہیں کرتا ۔
دنیا میں ہونے والے تمام واقعات
وقت ہی کے کسی موڑ پر نمودار ہوتے ہیں ۔
اور وقت ہی کسی لہر کے ساتھ
نظروں سے اوجھل ہو جاتے ہیں
وقت ہی سب کو پرکھنے والا ہے ۔
مگر آج وقت ہی آزمائش میں مبتلا ہے
وہ دیکھو وہ اب تنہا رہ گئے ہیں جو دراصل تنہا نہیں ہیں
ان کے ساتھ گزرے زمانوں کے تمام اکابر ہیں
شجاعت پیشہ، ایثار پیشہ، وفا شیوہ
نیکی کرنے والے انصاف کرنے والے
رہنما، مفکر
گزرے زمانوں کے تمام اکابر
اور وہ بھی جو ابھی مستقبل کے پردے میں ہیں

سب ان کے ساتھ ہیں
اور ہاں وہ بھی ان کے ساتھ ہیں
جنھوں نے کہا تھا
انا النبی لاکذب ان ابن عبد المطلب
اور وہ بھی جو کبھی کنزِ مخفی تھا
سب ان کے ساتھ ہیں
اس لئے کہ آج بڑے عجیب فیصلے ہو رہے ہیں
آج کئی طوفان اس کے صبر و استقلال سے ٹکرائے ہیں
آج اس نے کئی روشن ستاروں کو زمین پہ گرتے دیکھا ہے
وہ پوری کہکشاں کا غم برداشت کر چکا ہے
اور اب!
اب آخری فیصلہ
اپنی پیشکش
وہ بہن سے کہتا ہے
خُدا حافظ
گھرانے کو علیل بیٹے کے سپرد کرتا ہے
اور اسے محافظِ حقیقی کو سونپتا ہے
اے خدا اس دن کیا ہوا تھا
کیا شب و روز کے سلسلے میں ایسا کوئی اور دن ہے
ایک آفتاب ہے
جو اپنی تمام روشنی سمیٹے

اس مرکز پر آتا ہے
جہاں بگولے جمع ہیں
بے شمار بگولے
صف بہ صف گروہ در گروہ
جو دیکھتے ہیں مگر نہیں دیکھتے
جو سنتے ہیں مگر نہیں سنتے
جنہوں نے خسارے کا سودا کیا ہے ۔
آفتابِ عالم تاب ان سے کلام کرتا ہے
وہ کلام جو سچ ہے جو بہت بڑا سچ ہے
اور یوں اتمامِ حجت ہوتا ہے ۔
اور پھر وہ سانحہ ظہور پذیر ہوتا ہے
جو کاش نہ ہوتا
پھر ایک دنیا تمام ہوتی ہے
کہ نئی دنیا نیا عہد نمودار ہو
لفظوں کو اپنا کھویا ہوا مفہوم مل جائے ۔

★

اُفقِ کربلا پر ڈوب جانے والے سورج کے نام

محمد علی سیّد

سورج
دوبارہ طلوع ہونے کے لئے
غروب ہوتا ہے

موسمِ بہار کی
خوشگوار ساعتیں
واپس آنے کے لئے
سوکھے پتّوں میں کھو جاتی ہیں

بارشوں کے موسم
لوٹ آنے کے لئے
آسمان کی پُراسرار فضاؤں میں
گم ہو جاتے ہیں

کہ اسی طرح
انسانوں کا امتحان لیا جائے
ناامیدی کی تاریکیوں سے
خزاں کی بے رحم ساعتوں سے
اور خشک سالیوں سے

جو لوگ
تاریکیوں، بے رحم ساعتوں
اور خشک سالیوں میں
صبر کی چادر اُوڑھ لیتے ہیں
اور سیاہ رات میں
اپنے لہو سے روشنی کرتے ہیں
وہ زندہ رہتے ہیں

ان کے مقدّس لہو سے
جانے کتنے سورج طلوع ہو جاتے ہیں

اور پھر یہ روشنی
انسانی آبادیوں میں
پھیلتی چلی جاتی ہے۔

جلے ہوئے درختوں
اور سوکھے ہوئے پتّوں کے
عقب سے
موسم بہار کی نقرئی گھنٹیاں
بجنے لگتی ہیں
آسمان کی
پُراسرار فضاؤں میں
گم ہو جانے والے
بارشوں کے موسم
خشک زمینوں کی طرف
پلٹ پڑتے ہیں
اور صبح کی سنہری روشنی میں
انسانی بستیوں پر
سفید مقدّس پرندے پرواز کرنے لگتے ہیں

غمِ لازوال

مخدوم منوّر

ازل کی گود
ابھی آنسوؤں سے تازہ ہے
وہ رنگ وہ خوشبو بھی
تازہ ہے
جس نے مشامِ انسانیت کو معطّر کر دیا
جس کی دھڑکنیں
آج بھی قطرہ قطرہ
ہمارے جسموں کی حرارت بن گئی ہیں
یہی محبت خون میں
لحظہ لحظہ اُتر رہی ہے
محبتوں کے کم سن بچّوں
اور بوڑھوں نے
پانی کے دھارے کو
اپنی خاموشی اور انسانیت کے

دہکتے ہوئے
لاوے سے علم کی نذر کر دیا تھا

یہ عسیم لازوال
گذرتے ہوئے لمحوں کے ساتھ
مقدس ہے
کم سن بچے کی آواز
کائنات کی آواز بن گئی ہے
جب شبنمیں قطرے استقبال کے لئے
آسمانوں سے گرے
اور تپتی ہوئی ریت پر
چاند نے سایہ کیا
تو مشرق سے مغرب تک
بہتّر کا عدد گونج رہا تھا
آج تک
عقیدتوں کا جلوس
انسانیت کا گلاب
عظمت کا سبق
منزل کی جانب رواں دواں ہے

منزہ ذہن

اور آئینہ دلوں کے بازو
توانا تھے
دو شاخیں جدا ہوئیں
لیکن درخت اپنی جگہ تناور تھا
اور ننھے پودے
اس کے سائے میں
معصوم مسکراہٹ سمیٹے
وقت کو زندہ کر رہے تھے
دھوپ اور خاک و خون کی آگ
سہتے ہوئے
رنگین وسعتوں کا علَم آسمانوں کو
چھو رہا تھا

مبارک ہیں وہ لوگ
جو تا ابد زندہ ہیں
اور ابد کی گود آنسوؤں سے
تازہ رہے گی۔

غمِ لازوال

مُرتّبین

مخدوم منوّر ـــ وزیری پانی پتی

ادبی معیار پبلیکیشنز صدر کراچی ۳